Registered No. L. 4186

رجب المرجب ۱۳۵۷ھ — جلد ۱۳ — عدد ۱

۷۸۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دار الاسلام (پٹھان کوٹ - پنجاب)

قیمت سالانہ پانچ روپے — قیمت فی پرچہ ۸ آنے

ترجمان القرآن

کے

سابق پرچے

ترجمان القرآن کے سابق پرچوں کی بہت مانگ ہے
ان دنوں اکثر حضرات نے یہ پرچے طلب فرمائے
ہیں۔ اب بہت کم باقی رہ گئے ہیں

★

محرم ۱۳۵۲ھ سے لیکر اب تک کے تمام پرچے ماسوا
چند ایک اعداد کے اکثر موجود ہیں اور ۸ آنے
فی پرچہ کے حساب سے مل سکتے ہیں
ضرورت مند حضرات جلد طلب فرمائیں
کیونکہ پھر اکثر جلدیں ناقص رہ جائینگی

مینیجر

فہرست مضامین

ماہ رجب ۱۳۵۷ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۳۸ء جلد ۱۳ - عدد ۱

باہتمام چودھری نیاز علی خاں صاحب پرنٹر و پبلشر، گیلانی الکٹرک پریس

لاہور میں طبع ہو کر دارالاسلام

پٹھان کوٹ سے شائع ہوا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

اعلان کیا گیا تھا کہ رجب کی اشاعت اس رسالہ کی اشاعت خاص ہوگی جس میں وہ تمام سیاسی مضامین یکجا درج کیے جائیں گے جو شعبان ۵۶ھ سے ابتک لکھے جا چکے ہیں۔ لیکن اوّل تو ان مضامین کی تدوین جدید کے سلسلہ میں نئے مباحث اس قدر کثرت سے پیدا ہو گئے کہ ان کو سمیٹنا سخت مشکل ہو گیا، اور خوف ہوا کہ پرچہ کی اشاعت میں غیر معمولی تاخیر ہو جائے گی۔ دوسرے اسی زمانہ میں ادارہ دارالاسلام کی تاسیس عمل میں آگئی جس کے بعد ضرورت محسوس ہوئی کہ ناظرین ترجمان القرآن کو بلا تاخیر اس کی اطلاع دی جائے اور اس ادارہ کی اسکیم اور دستور العمل کو بھی ان تک پہنچا دیا جائے۔ لہٰذا اشاعت خاص کو ملتوی کر کے یہ پرچہ شایع کیا جا رہا ہے۔ انشاء اللہ شعبان کی اشاعت اُس مجموعۂ مضامین پر مشتمل ہوگی جس کا وعدہ کیا گیا تھا۔

دارالاسلام کی تحریک جن مقاصد کے لئے شروع کی گئی ہے ان کی توضیح وقتاً فوقتاً ان صفحات میں کی جاتی رہی ہے لیکن درحقیقت یہ تحریک ابتک لوگوں کے لئے ایک معمّا ہے۔ ہر انقلابی تصور ابتدا میں معمّا ہی ہوا کرتا ہے اور انقلابی تصورات کی فطرت ہی کچھ ایسی واقع ہوئی ہے۔ مخالفین ہی نہیں بلکہ اس تحریک سے ہمدردی اور دلچسپی رکھنے والوں کے دل میں بھی اس کے متعلق طرح طرح کے سوالات پیدا ہوتے رہے ہیں اور ان کا جواب مانگنے کے لئے روز بروز زیادہ بے چینی کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ پوچھا جاتا ہے کہ "دارالاسلام" سے آخر تمہاری کیا

مراد ہے؟ کیا غیر مسلم حکومت کے اندر کوئی دارالاسلام بن سکتا ہے؟ جہاں انگریزی فوج اور پولیس موجود ہے، انگریزی عدالتیں قائم ہیں، انگریزوں کا قانون چل رہا ہے اور انگریزی دستور پر حکومت کا نظم ونسق قائم ہے کیا وہاں کوئی ایسی چیز موجود ہو سکتی ہے جسے "دارالاسلام" کہا جا سکے؟ اور اگر یہ نہیں تو کیا تمہارا مقصد اسلامی حکومت قائم کرنا ہے؟ لیکن یہ ہو کس طرح سکتا ہے؟ اوپر انگریزی حکومت پوری قاہرانہ طاقت سے مسلط ہے۔ اس کے نیچے غیر مسلم اکثریت ہے۔ اور ان دونوں کے نیچے تم ہو۔ منتشر۔ بےبس خستہ حال اور پراگندہ بال۔ اس حالت میں تم کس طرح اسلامی حکومت قائم کر دو گے؟ عقل وہوش کھو چکے ہو تو بات دوسری ہے۔ ورنہ ہمیں سمجھاؤ کہ ایسا عظیم انقلاب آخر رونما کیسے ہو سکتا ہے؟ اگر یہ محض آرزو اور تمنا کا اظہار ہے تو اس کے خوش آئند ہونے میں کلام نہیں۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم بھی اس تمنا میں تمہارے ساتھ ہیں۔ مگر خوابوں کی دنیا سے نکل کر آؤ عملی دنیا میں آکر ہمیں بتاؤ کہ یہ کیونکر ممکن ہے؟ اور ممکن کا کیا ذکر، اس نام کو تو اس حالت میں زبان پر لانا بھی مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ تم کہتے ہو ہم اسلامی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ ہندو کہیں گے ہم کو رام راج مطلوب ہے، سکھ اپنی حکومت چاہیں گے۔ اور ہر دوسری قوم یہی داعیہ لے کر اٹھے گی کہ حکومت ہماری ہو۔ درآنحالیکہ انگریز سب کے سر پر مشین گن لیے کھڑا ہے۔ اب ہندوستان کی مختلف قوموں کا اپنی اپنی قومی حکومتوں کے لیے الگ الگ جدوجہد کرنا اس کے سوا اور کیا نتیجہ دکھا سکتا ہے کہ یہ سب آپس میں دست بگریباں ہوں اور انگریز اطمینان کے ساتھ حکومت کرتا رہے۔

یہ شبہات اور اعتراضات ہیں جو ہمارے پڑھے لکھے، اسلامی جذبات رکھنے والے، اور اسلام کی ترقی وسربلندی کے لیے مخلصانہ بےچینی رکھنے والے افراد میں سے قریب قریب ۹۹ فی صدی لوگوں کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے ہیں۔

ایک دوسری جماعت کچھ اس سے بھی زیادہ قوی شبہات رکھتی ہے۔ اس کو اسی میں شبہ ہے کہ اس زمانہ میں کوئی اسلامی حکومت ——— مسلمانوں کی حکومت نہیں بلکہ قانون اسلام کی حکومت ——— چل بھی سکتی

ہے یا نہیں۔ ساڑھے تیرہ سو برس پہلے کا قانون، جو صحرائے عرب کے غیر متمدن بدوؤں میں پیدا ہوا، جو صدیوں پہلے کی سوسائٹی کے لئے وضع کیا گیا تھا، جس میں ہاتھ کاٹنے اور کوڑے لگانے اور سنگسار کرنے کی سزائیں ہیں، جس میں نو سو برس سے نشو و ارتقاء کا دروازہ بند ہے، آج اس دورِ تمدن میں کسی ترقی پذیر سوسائٹی اور عہدِ جدید کی ریاست (Modern State) کے لئے کیسے موزوں ہو سکتا ہے؟ مالیات کے پیچیدہ مسائل جو آج پیدا ہو رہے ہیں انہیں وہ کیسے حل کرے گا؟ صنعتی انقلاب نے جو پیچیدہ تر معاشی اور اجتماعی مسائل پیدا کر دیئے ہیں جنھیں حل کرنا اس زمانہ کے بڑے بڑے حکیموں اور مدبروں کے لئے مشکل ہو رہا ہے، ان کا حل وہ کہاں سے لائے گا؟ دورِ حاضر کی حکومت کے لئے دستور اور بین الاقوامی تعلقات کے لئے ضابطہ جو بہر حال درکار ہے، اس میں کہاں ملے گا؟ ــــــ یہ اور اس قسم کے بیسیوں سوالات ہیں جو آج غیر مسلموں ہی کے دلوں میں نہیں، خود مسلمانوں کے دلوں میں بھی پیدا ہو رہے ہیں۔ کوئی انہیں برملا زبان پر لاتا ہے اور کوئی ان کو دل ہی دل میں اپنی عقیدت مندی کے نیچے دبائے رکھتا ہے۔

جذباتی رنگ میں ان سب کو جواب دیدینا بہت آسان ہے۔ ایک گروہ سے کہہ دیجئے کہ تم پست ہمت ہو۔ مسلمان ہو کر ایسی کمزوری کی باتیں کرتے ہو! اٹھو اور اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ کا نقشہ جما دو۔ دوسرے گروہ کو ڈانٹ بتائیے کہ تم بدعقیدہ ہو، جاہل ہو، اگر تمھیں اسلام کے ایک مکمل ضابطۂ زندگی اور دائمی قانون ہونے میں شک ہے تو اپنے آپ کو مسلمان کیوں کہتے ہو ــــ ایسے جوابات سے سب کا نہیں تو کچھ لوگوں کا مُنہ ضرور بند کیا جا سکتا ہے، اور خطابت کا سکہ بھی جمایا جا سکتا ہے، مگر جب دار الاسلام کا نام لینے سے محض گرمیٔ محفل اور سستی شہرت مطلوب نہ ہو بلکہ فی الواقع سنجیدگی کے ساتھ اسے نصب العین بنایا گیا ہو اور اس کو حاصل کرنا حقیقت میں مطلوب ہو تو اس کے سوا چارہ نہیں کہ دونوں قسم کے شبہات کو اطمینان بخش طریقہ سے دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ ایک گروہ کو بتایا جائے کہ یہ چیز جو بظاہر غیر ممکن نظر آتی ہے، اس طرح ممکن ہے، اور اس تک پہنچنے کا صحیح راستہ یہ ہے۔ اور

دوسرے گروہ کو بتایا جائے کہ اسلام نہ صرف ماڈرن بلکہ الٹرا ماڈرن اسٹیٹ کو چلانے کے لئے بھی ایک بہتر دستور اور ضابطہ رکھتا ہے جو ایک ایک جز میں موجودہ زمانہ کے جمہوری اور فاشستی اور سوویٹ دستوروں سے فائق تر ہے۔ موجودہ زندگی کا ایک ایک مسئلہ جس کو تم پیچیدہ سمجھتے ہو، اس کو اسلام نے زیادہ سائنٹفک اور زیادہ صالح طریقہ سے حل کیا ہے۔

یہ طرز جواب اختیار کرنا ہمارے لئے ناگزیر ہے اگر ہم اپنے نصب العین کی طرف مسلمانوں ہی کو نہیں بلکہ وسیع تر انسانیت کے معقولیت پسند اور کارکن اور کارفرما عنصر کو کھینچنا چاہتے ہیں۔ سراسر جذباتی لوگ بھی اگرچہ ایک حیثیت سے مفید ہوتے ہیں اور ایک موقع پر ان کی ضرورت ہوتی ہے لیکن محض ان کے ہاتھوں سے کوئی حقیقی اور پائدار انقلاب برپا ہو جانا ممکن نہیں۔ ان کے ساتھ تعمیری قابلیتیں رکھنے والوں کا اشتراکِ عمل ضروری ہے اور وہ حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ دل کے ساتھ دماغ سے بھی اپیل نہ کیا جائے۔

ہمارے متعلق لوگوں کے خیالات خواہ کچھ ہوں ـــــ اور کون ہے جس کے متعلق مختلف خیالات لوگوں میں پائے نہیں جاتے ـــــ مگر اپنی جگہ ہم اپنے مقصد میں بالکل سنجیدہ ہیں اور اسے حاصل کرنے کا قطعی ارادہ رکھتے ہیں، اس لئے ہم ان شبہات اور سوالات کو خطابت سے دبانا نہیں چاہتے بلکہ معقولیت سے جواب دینا چاہتے ہیں تاکہ ہماری قوت میں اضافہ ہو۔

ادارۂ دارالاسلام کے دستور العمل سے پہلے توضیح مقاصد و طریق کار کے عنوان سے جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا مدعا یہی ہے۔ اس میں ہم نے پہلے گروہ کے تقریباً ہر سوال کا جواب دیا ہے، اور دوسرے گروہ کے سوالات کا جواب دینے کے لئے جس تیاری کی ضرورت ہے اس کا خاکہ پیش کر دیا ہے۔ پہلا گروہ ہم سے قریب تر ہے سب سے پہلے ہم اس کو مطمئن کرنا چاہتے ہیں۔ وہ مطمئن ہو تو ہمیں اپنے علمی اور عملی شعبوں کے لئے رنگروٹ ملیں۔ اور یہ فوج مرتب ہو تب کہیں ہم دوسرے گروہ کو فتح کرنے کے لئے آگے بڑھ سکیں گے۔

پہلے گروہ کے سوالات کا جو جواب ہم نے دیا ہے اگرچہ وہ ہمارے لئے واضح ہے، مگر ہم کو خود احساس ہے کہ وہ دوسروں کے لئے، اور خصوصاً شبہات رکھنے والوں کے لئے اتنا واضح نہیں ہے۔ بہت سی چیزیں ہیں جن کو سمجھنے میں وہ اب بھی الجھیں گے۔ مثلاً ہماری دفاعی پالیسی میں ان کو اس قسم کے سوالات پریشان کریں گے کہ مسلمانوں کی موجودہ سیاسی جماعتوں کے رویہ میں تم کیا نقائص پاتے ہو اور اس میں کس نوعیت کا تغیر چاہتے ہو؟ بین الاقوامی وفاق، مساویانہ حصہ داری اور کلچرل آٹانومی، جن کے مجموعہ کو تم شبہ دارالاسلام سے تعبیر کرتے ہو اس کی تفصیلی صورت کیا ہے؟ آخر وہ کونسے انقلابی ذرائع ہیں جو اس ابتدائی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے کارگر، ممکن العمل اور ضروری ہیں؟ پھر اس مرحلے کو طے کرنے کے بعد تم آخری مرحلے کی طرف کس راستہ سے بڑھو گے؟ یہ سوالات قدرتی طور پر پیدا ہوتے ہیں اور تفصیلی بحث چاہتے ہیں۔

ان شاء اللہ الکریم ترجمان کی آئندہ اشاعتوں میں ہم خود ان سوالات کو چھیڑ کر ایک ایک کی توضیح و تشریح کریں گے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہم ان سب لوگوں سے جو ہمارے دستور العمل کے مقدمہ کا مطالعہ کریں، درخواست کرتے ہیں کہ اس پر زیادہ سے زیادہ گہری تنقیدی نگاہ ڈالیں، اور جس قدر اعتراضات ان کے ذہن میں پیدا ہوں اُن سے ہمیں مطلع فرمائیں تاکہ ہر ممکن پہلو سے ان مسائل پر روشنی ڈالی جا سکے۔

دوسرے گروہ کا معاملہ اگرچہ نسبتہً موخر ہے، مگر اس سے بھی ہم غافل نہیں ہیں۔ ادارہ دارالاسلام کی تاسیس عمل میں آتے ہی اولین کام جو کیا گیا وہ علمی شعبہ کا قیام تھا۔ سردست اس میں صرف دو آدمی ہیں۔ ایک مولوی صدرالدین اصلاحی۔ دوسرا ابوالاعلیٰ مودودی۔ اگرچہ بے سروسامانی قابل داد ہے۔ اتنا عظیم الشان کام سامنے ہے اور صرف دو آدمی اس کی ابتدا کر رہے ہیں، اور وہ بھی اس حال میں کہ کتب خانہ گویا موجود ہی نہیں۔ لیکن اگر ہمارا عزم راسخ اور ہماری نیت خالص ہے تو یہی بے سروسامانی

جس پر شائد بعض لوگ مضحکہ اڑانے میں بھی تامل نہ کریں گے، ایک روز رحمتِ الٰہی کی مستحق ثابت ہوگی ـــــ اس شعبہ کے لئے ہم کو ایک اعلیٰ درجہ کا منتخب کتب خانہ درکار ہے، اور نوجوانوں کی ایک ایسی جماعت مطلوب ہے جو بہترین ذہنی صلاحیتیں رکھنے کے ساتھ اونچے ارادے اور ان ارادوں میں اپنے آپ کو فنا کردینے کی قوت رکھتے ہوں خصوصیت کے ساتھ ہماری آنکھیں علی گڈھ، دیوبند، جامعہ ملیہ، ندوہ، مدرسۃ الاصلاح، اور جامعہ دارالسلام کے نونہالوں کی طرف لگی ہوئی ہیں۔

اس کے ساتھ شعبۂ اشاعت بھی قائم کردیا گیا ہے جس سے "مسلمانانِ ہند اور موجودہ سیاسی کشمکش" کا حصّہ دوم عنقریب شائع ہوگا، اور اس کے بعد اُن مضامین کے مجموعوں کی اشاعت شروع کردی جائے گی جو گذشتہ پانچ چھ سال کی مدت میں بہت سے فقہی، تمدنی، معاشی اور اعتقادی مسائل پر ترجمان القرآن میں شائع ہوچکے ہیں، مثلاً "اسلامی تہذیب اور اس کے اصول ومبادی"، "حقوق الزوجین"، "مسئلہ سود"، "مسئلہ حجاب"، "قومیتِ اسلام" وغیرہ جن حضرات نے ان مضامین کی اشاعت کے لئے حیدرآباد میں مجھے روپیہ بھیجا تھا ان کی تمام رقمیں ادارہ کے بیت المال میں داخل کردی گئی ہیں اور یہیں سے ان کو باقاعدہ حساب بھیجا جائے گا۔

یہ کہنے کی حاجت نہیں کہ اس موقع پر ہمارے لئے کم ازکم ایک ہفتہ وار اخبار کی سخت ضرورت ہے محض ایک ماہوار رسالہ ان مقاصد کے لئے بالکل ناکافی ہے جو ہمارے پیشِ نظر ہیں۔ جب تک ہمارا ایک پرچہ تیار ہوکر نکلتا ہے دنیا کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے۔ ہمارا اور حریف طاقتوں کا مقابلہ گویا چھکڑے اور موٹر کا مقابلہ ہے۔ روزانہ بیسیوں مسائل پیش آتے ہیں جن پر وقت کے وقت لکھنے کی ضرورت ہوتی ہے، مگر ہمیں مجبوراً دوسرے مہینہ کا انتظار کرنا پڑتا ہے اور ماہوار رسالہ کی اشاعت کا وقت آتے آتے وہ مسائل پرانے ہوکر رہ جاتے ہیں۔ علاوہ بریں اس رسالہ کی حیثیت بھی اس کی متقاضی ہے کہ اس کو صرف اصولی مباحث کے لئے مخصوص رکھا جائے اور اگر فروعی مسائل چھیڑے بھی جائیں تو صرف اس حد تک کہ ان سے اصول کی تشریح ہوسکے۔ اس سے زیادہ تفصیلی و جزئی

مسائل کا یہ متحمل نہیں ہو سکتا۔ بہرحال اس کے لئے ایک اخبار ہی کی ضرورت ہے۔

ابھی حال میں ایک عالم دین نے اس مخصوص جرأت کے ساتھ جو اس دور حریت کے صلحاء و اتقیاء ہی کو میسر آ سکتی ہے، اپنے اخبار کے ذریعہ سے دنیا کو اطلاع دی ہے کہ ادارہ دارالاسلام کو پچاس ہزار روپیہ ملا ہے۔ کاش یہی خبر سچی ہو گئی ہوتی!۔

دستورالعمل کے باب میں بھی چند شبہات پیدا ہو سکتے ہیں جنھیں اس موقع پر صاف کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ایک دوست نے لکھا اور بعض حضرات نے مجلس مشاورت میں بھی اس خیال کا اظہار کیا کہ اس دستورالعمل میں بہت زیادہ قوانین و ضوابط بنائے گئے ہیں، اور تفصیلات و جزئیات کے استقصا میں غلو برتا گیا ہے حالانکہ ضوابط کو عملی زندگی اور تجربہ کی ترقی کے ساتھ فطری طور پر نشوونما پانے اور جڑ پکڑنے کے لئے چھوڑ دینا چاہئے ——— یہ اعتراض کافی وزن رکھتا ہے۔ میں خود بھی دستورالعمل کی تسوید کے وقت اس پہلو سے خالی الذہن نہ تھا۔ مگر اس کے ساتھ ایک دوسرا پہلو بھی میرے سامنے تھا جس نے مجھے اتنی تفصیلات بیان کرنے پر آمادہ کیا اور وہ اس سے زیادہ وزن رکھتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ ہم ایک ایسا انقلابی تصور لے کر اٹھے ہیں جو تمدن و اجتماع کے موجودہ نظم و ترتیب اور اجتماعی زندگی کے رائج الوقت طریقہائے عمل کو قریب قریب الٹ دینا چاہتا ہے اور زندگی کے ہر شعبہ میں اپنی فطرت اور اپنے مزاج کے مطابق ایک نئی ذہنیت، نئی ترتیب، نیا نظام، اور نیا طرز عمل مانگتا ہے۔ جن لوگوں کے پیش نظر صرف یہ چیز ہے کہ مسلمان ——— جو مسلمانوں کی نسل سے پیدا ہونے کی وجہ سے مسلمان کہلاتے ہیں اور مردم شماری میں مسلمان لکھے جاتے ہیں ——— ان کا قومی تشخص برقرار رہے اور ایک مستقل قوم ہونے کی حیثیت سے وہ ترقی اور سربلندی حاصل کریں، ان کی انقلاب پسندی کا تقاضا تو اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ جہاں غیر مسلم کو تمکن حاصل ہے وہاں مسلمان متمکن ہو جائے، قطع نظر اس سے کہ اس کی ذہنیت کا سانچہ اور

اس کی زندگی کا نظام کوئی بھی ہو۔ ان کے پیشِ نظر نظام ہے ہی نہیں۔ وہ سرمایہ دارانہ جمہوریت کی تقلید بھی کر سکتی ہیں، اشتراکی سوفیات (Soviets) کی نقل بھی اتار سکتے ہیں، اور ہٹلریت و مسولنیت کو بھی اسٹوبا سکتی ہیں لیکن ہماری انقلاب پسندی محض مادی انقلاب نہیں چاہتی بلکہ اخلاقی اور نظمی انقلاب چاہتی ہے۔ ہم موجودہ غیر اسلامی نظام کو الٹ کر ایک نئی اجتماعی زندگی کی تعمیر چاہتے ہیں جس کی بنا اسلامی ذہنیت اور اسلامی اصولوں پر ہو۔ اس لئے موجودہ زمانہ کے جمہوری ادارات یا فاشستی نظامات کا ڈھنگ اختیار کرنا ہمارے لئے مشکل بلکہ محال ہے۔

اب ایک بڑی دشواری یہ پیش آتی ہے کہ اسلامی طرز ادارہ مدتہائے دراز سے معطل ہے۔ صرف غیر مسلم ہی نہیں بلکہ عموماً مسلمانوں کی طبائع بھی اس سے مانوس نہیں رہی ہیں۔ موجودہ زمانہ کے ادارات کا طریق کچھ اس طرح فضا پر چھایا ہوا ہے کہ اچھی خاصی اسلامی ذہنیت کے مسلمان بھی بمشکل اس امر کا تصور کر سکتے ہیں کہ اسلامی جمہوریت کس طرز پر کام کرتی ہے۔ اس کے بنیادی اصولوں کا ایک دھندلا سا خاکہ تو ان کے ذہن میں آسکتا ہے، مگر عملی تفصیلات میں کہیں فاشستی آمریت (ڈکٹیٹر شپ) کے طور طریقے ان کے سامنے آجاتے ہیں، اور کہیں جمہوری ادارات کے طریق کارروائی کی طرف بلا ارادہ ان کا ذہن منتقل ہو جاتا ہے۔ اگر دستور العمل میں محض اتنا لکھ دیا جائے کہ "یہ ادارہ اسلامی جمہوریت کے طرز پر کام کرے گا" تو روزمرہ کے کاروبار میں ارکان کے لئے اس کی تعبیر و تفسیر کرنا مشکل ہو جائے گا، اور آئے دن جزئی معاملات میں کارکنوں کی پراگندگی فکر و عمل سے اتنی پیچیدگیاں پیدا ہوں گی کہ ان کے حل کرنے ہی میں صدر ادارہ کا سارا وقت کھپ جائے گا۔ اسی خرابی کو دور کرنے کے ضروری سمجھا گیا کہ دستور العمل میں اسلام کے جمہوری طرز ادارہ کی تفصیلی صورت پیش کر دی جائے۔ یہ مصلحت اس وقت اور زیادہ واضح ہوگئی جب ہماری مجلس مشاورت میں دستور العمل کے مسودہ پر کامل تین روز تک مباحث کا سلسلہ جاری رہا۔ ان مباحث سے اندازہ ہوا کہ اسلامی جمہوریت کے طریق کارروائی کو سمجھنا ہمارے موجودہ ماحول میں لوگوں کے لئے کس قدر مشکل ہے اور اس کے جزئیات ہی نہیں، اصول

اور کلیات تک کے متعلق کتنے غلط تصورات دماغوں میں بیٹھے ہوئے ہیں۔

دستور العمل کا تفصیلی مطالعہ کرتے وقت بعض چیزوں کو دیکھ کر لوگوں کو شبہ ہوگا کہ یہ زمانۂ حال کے جمہوری ادارات کی نقل ہے، اور بعض دوسری چیزوں کو دیکھ کر وہ گمان کریں گے کہ شاید یہاں ڈکٹیٹر شپ کو اسوہ بنایا گیا ہے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اسلامی جمہوریت کے اصولوں کی بھی تھوڑی سی تشریح کردی جائے۔ اگرچہ یہ موضوع ایک اشارہ نہیں بلکہ ایک کتاب مانگتا ہے، مگر العاقل تکفیہ الاشارۃ۔

علم السیاست کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ حاکمیت (Sovereignty) کس کی ہے۔ اس کے حل کی مختلف صورتیں انسان نے اختیار کی ہیں۔ ایک صورت بادشاہی کی ہے جس میں حاکمیت سمٹ کر ایک شخص کی ذات میں مرتکز ہو جاتی ہے۔ دوسری شکل جمہوریت کی ہے جس کی اساس عمومی حاکمیت (Popular Sovereignty) پر رکھی گئی ہے۔ پہلی صورت میں جو فساد تھا اسے دور کرنے کے لئے دوسری صورت اختیار کی گئی مگر یہ بھی فساد سے لبریز نکلی۔ ظاہر ہے کہ عامۃ الناس کی حاکمیت عملاً قائم نہیں ہو سکتی۔ عملی اغراض کے لئے بہر حال اس کو کہیں نہ کہیں مرکوز کرنا پڑے گا اور جہاں بھی وہ مرکوز ہوگی وہیں سے فساد رونما ہوگا عام اس سے کہ وہ سرمایہ دار طبقہ میں مرکوز ہو، یا عمال کے طبقہ میں، یا ایک منظم پارٹی میں، یا کسی مقبول عام ڈکٹیٹر میں۔ اس فساد کے اسباب کی بہت کچھ چھان بین کی گئی ہے، لیکن اصلی سبب تک لوگوں کی نظر نہیں پہنچی۔ اس کا اصلی سبب حاکمیت کا غیر محدود ہونا ہے۔ حاکمیت مطلقہ (Unlimited Sovereignty) خواہ عوام کی ہو یا ایک خاص طبقہ کی یا ایک شخص کی، ہر صورت تمام خرابیوں کی جڑ یہی ہے۔ ایک ایسی حد کا ہونا ہر حال میں ضروری ہے جو انسان کے اختیارات کو حدِ اعتدال میں رکھے، اور یہی حد انسانی کوششیں آج تک فراہم نہیں کر سکیں۔ اسلام کو یہ امتیاز حاصل ہے

کہ اس نے وہ چیز فراہم کر دی ہے جو انسانی اختیار کی صحیح حدبندی کر دیتی ہے یعنی **حدود اللہ**۔ ان حدود میں کسی کی حاکمیت نہیں، نہ کسی شخص کی نہ پوری جماعت کی۔ کوئی قانون ان کے خلاف وضع نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی حاکم ان کے خلاف حکم نہیں دے سکتا۔ کوئی ان کو توڑنے کے بعد اطاعت کا مستحق نہیں رہتا۔ یہ ایسا کانسٹی ٹیوشن ہے جس میں کوئی ترمیم ممکن نہیں۔

ان حدود کی نگہداشت پر اجتماعی معاملات کی درستی کا تمام تر انحصار ہے، کیونکہ یہ انسانی آزادی کا میگنا کارٹا، انسان کے بنیادی حقوق کا اعلان، اور انسانی تعلقات کی ایسی ٹھیک ترتیب (Setting) ہے جس میں ذرا سا فرق آجانے سے فساد کو گھس آنے کا راستہ مل جاتا ہے۔ اس نظم کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ایک طرف تو جماعت میں اتنا علم اور تقویٰ اور مضبوط کیرکٹر موجود ہو کہ وہ ان حدود کو سمجھے اور ان کو توڑنے سے ڈرے اور سختی کے ساتھ ان کی حفاظت کرے۔ اور دوسری طرف اس میں وہ طاقت موجود ہو جس سے وہ ان کی حفاظت کر سکے۔ پہلی چیز تعلیم و تربیت کے اس نظام سے پیدا ہوتی ہے جسے اسلام نے تجویز کیا ہے۔ اور دوسری چیز اسلام کا نظام جمہوریت ہے جس میں حدود اللہ کو مستثنیٰ کر کے تمام مسلمانوں کو بلا امتیاز طبقہ و گروہ، عام حاکمیت دی گئی ہے۔ ہر مسلمان اس حاکمیت میں یکساں حصہ دار ہے۔ ہر مسلمان اس دولت مشترکہ کا یکساں مالک ہے۔ ہر مسلمان کا مفاد اس میں دوسرے مسلمان کے برابر ہے۔ ہر مسلمان کو حق رائے دہی حاصل ہے۔ ایک کروڑپتی کے ووٹ اور ایک فقیر کے ووٹ میں اصلاً کوئی فرق نہیں، البتہ اگر فقیر زیادہ علم اور تقویٰ رکھتا ہے تو کروڑپتی کے ووٹ سے اس کا ووٹ زیادہ وزنی ہے۔ حق اور صواب کا مدار کثرت و قلت پر نہیں ہے۔ نہ کوئی چیز اس بنا پر صواب ہے کہ اس کے حق میں ہزار ہاتھ اٹھتے ہیں اور نہ کوئی اس لئے خطا ہے کہ اس کے حق میں ایک ہاتھ اٹھتا ہے۔

اس جمہوریت کو چلانے کے لئے جو نظام تجویز کیا گیا ہے وہ مغرب کے جمہوری دستوروں سے بالکل مختلف ہے،

اس لئے کہ اس کی فطرت ان سے مختلف ہے۔ وہاں حدود اللہ موجود نہیں ہیں، اور غیر محدود حاکمیت کو ایک جگہ مرکوز کر دینے سے تلخ تجربے ہوئے ہیں اس لئے ہر دستور کی تشکیل عدم اعتماد (Mistrust) کی بنیاد پر کی گئی ہے۔ واضعین دستور کی تمام تر کوشش یہ رہتی ہے کہ حاکمیت کہیں مرکوز نہ ہونے پائے اور ہر جگہ جہاں حاکمیت مجتمع ہو وہاں تحفظات (Safe-guards) اور موانع (Checks) بھی ہوں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ مغرب میں جمہوریتیں ناکام ہو رہی ہیں اور ان کی جگہ ملوکیت کی ایک دوسری شکل یعنی آمریت (Absolute Monarchy) لے رہی ہے جس کو محدود کرنے والی چیز رعایا کی بغاوت یا اندیشۂ بغاوت کے سوا کوئی نہیں ——— بالفاظ دیگر وہ ایک ایسا فساد ہے جسے ایک عظیم تر فساد کے سوا کوئی دوسری چیز دفع نہیں کر سکتی ——— اس کے برعکس اسلام میں حدود اللہ موجود ہیں، اور اجتماعی اخلاق کی بنا تقویٰ پر رکھی گئی ہے نہ کہ معاشی مفاد پر اس لئے یہاں دستور کا نقشہ بالکل بدلا ہوا ہے۔ یہاں عمومی حاکمیت کی تعبیر اس طرح کی گئی ہے کہ قوم اپنے میں سے ایک شخص کو منتخب کرے جس کے علم، تقویٰ اور حسن تدبیر پر اس کو اعتماد ہو۔ اپنی حاکمیت کو بطور امانت اس کے سپرد کر دے جب تک وہ حدود اللہ کا پابند رہے سب اس کی اطاعت کریں۔ شوریٰ اس لئے ہو کہ اسے حق اور صواب تک پہنچنے میں مدد دی جائے، نہ اس لئے کہ تحفظات اور موانع سے اس کو جکڑ بند کیا جائے۔ جب تک قوم کو اس پر اعتماد رہے، عمومی حاکمیت کی یہ امانت اس کے سپرد رہے، اور جب وہ حدود اللہ سے تجاوز کرے، یا اس امانت میں غلط تصرف کر کے قوم کا اعتماد کھو دے تو وہ اس سے واپس لے لی جائے۔ اس نظام میں تنقید کے عمومی حق اور امانت واپس لے لینے (Recall) کے اختیار کے سوا کسی تحفظ کی حاجت نہیں۔

ہم نے اپنے دستور میں اس طرز جمہوریت کو اختیار کیا ہے۔ مگر یاد رکھنا چاہئے کہ یہ نظام صرف اسی وقت چل سکتا ہے جبکہ جمہور قوم میں حدود اللہ کا علم، ان کی نگہداشت کا مضبوط ارادہ اور تقویٰ کی روح موجود ہو۔ یہ کچھ اسلامی دستور پر ہی موقوف نہیں، دنیا کا کوئی دستور بھی قائم نہیں رہ سکتا اگر اس کی پشت پر رائے عام کی طاقت نہ ہو۔ ہر دستور اپنے حق میں رائے عام کی حمایت چاہتا ہے۔ انگلستان کا پارلیمنٹری نظام حکومت صرف اس وجہ سے چل رہا ہے کہ انگریزی قوم اس کو برقرار رکھنے

کا غیر متزلزل ارادہ رکھتی ہے اور کوئی شخص اپنے سر کو خطرے میں ڈالے بغیر اس کو توڑنے کا خیال بھی نہیں کر سکتا۔ اٹلی اور جرمنی کی دستوری نظام صرف اسی لئے ٹوٹ گئے کہ قوم میں ان کی حفاظت کا کوئی اجتماعی ارادہ موجود نہ تھا۔ بالکل اسی طرح اسلام کا جمہوری نظام بھی اپنی پشت پر صالحین و متقین کی جماعت چاہتا ہے جن میں اس نظام کی صحیح اسپرٹ اور اس کو برقرار رکھنے کی عزیمت موجود ہو۔ ابتدائی دور میں یہ نظام اسی لئے ٹوٹ گیا کہ نومسلموں کی بہت بڑی تعداد اسلامی جماعت میں داخل ہو گئی تھی جس کو اسلام کی اخلاقی تربیت کافی نہ ملی تھی اور اس انبوہ میں صالحین و متقین کا تناسب اس قدر کم رہ گیا تھا کہ قوم بحیثیت مجموعی خلافت راشدہ کے دستور کی حفاظت نہ کر سکتی تھی۔ اگر اسلامی جماعت میں توسیع (Expansion) اور استحکام (Consolidation) کا توازن قائم رہتا تو یہ صورت ہرگز پیش نہ آتی۔ اس سے بہت زیادہ، بدرجہا زیادہ کمزور اخلاقی حالت آج ہماری قوم کی ہے اور ہم خوب جانتے ہیں کہ ایک صحیح اسلامی نظام جمہوریت کا سنبھالنا ایسی قوم کے لئے کس قدر مشکل ہے۔ اسی بنا پر ہم نے اپنے دستور العمل میں حلف رکنیت اور اخلاقی تربیت کو لازم کیا ہے اور رکنیت کے لئے کڑی شرطیں لگائی ہیں تا کہ قوم میں جو صالح عناصر — کمیاب و نادر — موجود ہیں وہ ہر طرف سے کھنچ کھنچ کر اس نظام میں داخل ہوتے چلے جائیں اور بتدریج اخلاقی تربیت حاصل کر کے وہ طاقت پیدا کریں جو ایسے ایک نظام کو کامیابی کے ساتھ چلانے کے لئے ضروری ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس طرح ہمارے ہاں اسلامی جمہوریت کی روایات پرورش پائیں اور رفتہ رفتہ ایک جماعت روز افزوں تعداد میں پیدا ہوتی جائے جو آگے چل کر اسلامی اصولوں پر ایک نئے انقلابی نظام سیاست کو قائم کرنے اور چلانے کے قابل ہو۔

ایک دوست نے علمی شعبہ کی اسکیم میں صدر کی ہدایت و رہنمائی پر اعتراض کیا ہے۔ انہیں اس میں ذہنی استبداد Intellectual despotism اور "ملا شاہیت" کی بو آئی جو حقیقی اجتہاد فکر اور علمی تحقیق کے لئے سم قاتل ہے۔ لیکن ہم انہیں یقین دلاتے ہیں کہ یہاں اس چیز کا تو خیال بھی نہیں ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہم اس کام کا دروازہ کھول رہے ہیں جو نہایت ضروری ہونے کے ساتھ نہایت نازک بھی ہے یعنی اجتہاد۔ آج کل لوگوں کو اس کی ضرورت کا تو ایک حد تک احساس ہو گیا ہے مگر اس کی نزاکت کا احساس نہیں ہے۔ وہ اجتہاد کو بچوں کا کھیل سمجھتے ہیں، اور ناکافی معلومات، اور اس سے بھی زیادہ ناکافی علمی تربیت

کے ساتھ اس میدان میں دادِ تحقیق دینے لگتے ہیں جس کے مضحکہ انگیز نمونے کمیاب نہیں ہیں۔ ایسے اجتہاد کا دروازہ کھولنے سے ہم خدا کی
پناہ مانگتے ہیں۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ جو شخص اس شعبہ میں داخل ہو وہ خواہ درجۂ اوّل ہی کا دماغ (First rate mind)
کیوں نہ رکھتا ہو، بہرحال اسے محقق و مجتہد بننے سے پہلے ایک طالب علم کی حیثیت اختیار کرنی چاہئے اور وہ ضروری استعداد بہم پہنچانی
چاہیے جس کے بغیر آدمی مجتہد نہیں بن سکتا۔ آخر مغرب کی یونیورسٹیوں میں بھی تو ریسرچ اسکالرس کو ابتداءً پروفیسر کی رہنمائی
ہی میں کام کرنا پڑتا ہے، اور انہیں میدانِ اجتہاد میں قدم رکھنے کی اجازت اس وقت ملتی ہے جب کافی مدت تک تربیت پانے کے بعد
وہ اپنے محقق ہونے کا ثبوت دے دیتے ہیں۔ شاید کوئی علمی حلقہ بھی اس بات کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ ہوگا کہ جب کوئی شخص اپنے متعلق
خود سمجھ لے کہ میں محقق ہو گیا ہوں تو بس وہ محقق ہو گیا اور اسے حق حاصل ہو گیا کہ جس فن میں چاہے مجتہدانہ آراء دے۔ پس جب ساری
دنیا کے علمی حلقوں میں اس کام کے لئے کچھ شرائط اور اصول ہیں اور وہ قابلِ اعتراض نہیں ہیں تو ہمارے علمی شعبہ ہی نے کیا قصور کیا ہے
کہ یہاں اس قسم کی شرائط اور اصول مقرر کرنا ذہنی استبداد قرار پائے؟ ہمیں اسلام کو بازیچۂ اطفال تو بنانا نہیں ہے۔ ہم کس طرح
ایک شخص کو پختگی حاصل کرنے سے پہلے اجازت دے سکتے ہیں کہ وہ اسلام کے احکام کی من مانی تفسیر و تعبیر کرنے لگے۔ البتہ اس
شعبہ میں ہدایت اور رہنمائی کے معنی یہ بھی نہیں کہ طالبانِ تحقیق صدر کے غلام اور اس کی رعیت ہوں، اور وہ ان کی آزادیِ فکر و نظر
کو سلب کر کے انہیں اپنا مقلد بنالے۔ اگر یونیورسٹیوں کے تحقیقی شعبوں میں پروفیسر کی ہدایت اور رہنمائی کے یہ معنی نہیں ہوتے تو یہاں بھی اس کے یہ معنی نہیں لیے جائیں گے۔

میرے رفقاء نے مجھے اس ادارہ کا صدر منتخب کیا ہے اور میری اپنی درخواست پر یہ صدارت اس وقت تک کے لئے عارضی رکھی
گئی ہے جب تک چالیس ارکان فراہم نہ ہوں۔ میرا یہ خیال نہیں ہے کہ جو شخص کسی ادارہ کی بنا رکھے وہی اس کی صدارت کا حقدار ہے۔
میں اس غلط فہمی میں بھی مبتلا نہیں ہوں کہ یہ ادارہ جس قابلیت کا صدر چاہتا ہے وہ مجھ میں موجود ہے۔ اور میرے نزدیک جو شخص اس کام کی ذمہ داریوں کو
سمجھتا ہو وہ بیوقوف ہوگا اگر اس بار کو خود اپنے سر لینے کے لئے آگے بڑھے۔ یہ بوجھ ایسی چیز نہیں ہے کہ اس کی تمنا کی جائے۔ یہ تو کانٹوں کا بستر ہے۔ جو اس پر لٹا دیا گیا
وہ گویا بغیر چھری کے ہلاک کر دیا گیا اور ہمیشہ کے لئے زندگی کے لطف سے محروم ہو گیا۔ لہٰذا میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ آنے والے ۳۵ اشخاص میں اپنے کسی ایسے بندے کو
بھیج دے جس پر میرے رفقاء کی نظرِ انتخاب ٹھہر جائے، یا جسے میں خود صالح پا کر بیعت کے لئے ہاتھ بڑھاؤں۔ اگر میری جگہ کوئی عبدِ حبشی بھی اس ادارہ کا
صدر ہوگا تو باللہ العظیم اس کی ویسی ہی اطاعت کروں گا جس کا حدیثِ نبوی میں حکم دیا گیا ہے۔

ادارۂ دارالاسلام کی تاسیس

الحمد للہ کہ ۱۹ر شعبان ۵۷ھ (۱۴ر اکتوبر ۳۸ء) کو بروز جمعہ ادارۂ دارالاسلام کی تاسیس باقاعدہ عمل میں آگئی اور پانچ ارکان سے کام کا آغاز کر دیا گیا۔ اس موقع پر یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس عمل تاسیس کی مختصر روداد بیان کر دی جائے۔

محرم سے رجب تک کامل ۶ مہینے غور وخوض اور حالات کا مطالعہ اور اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے لوگوں کے ساتھ تبادلۂ خیال کرنے کے بعد پیش نظر کام کی اسکیم اور دستور العمل کا ایک خاکہ مرتب کیا گیا اور اس کی نقلیں تقریباً چالیس اصحاب کے پاس استصواب کے لئے بھیج دی گئیں۔ یہ اصحاب زیادہ تر وہ تھے جنھوں نے گذشتہ ایک سال کی مدت میں دارالاسلام کی تجویز کے ساتھ خاص طور پر دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ اور ان میں بعض ایسے بزرگ بھی تھے جن کے علم وفضل اور اصابت رائے سے استفادہ کرنا ضروری سمجھا گیا۔ مثال کے طور پر چند نام حسب ذیل ہیں :۔

مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی۔ مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدیر الفرقان۔ مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی۔ مولانا سید سلیمان ندوی۔ مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب۔ مولانا احمد سعید صاحب۔ مولانا احمد علی صاحب۔ مولانا امین احسن صاحب اصلاحی۔ ڈاکٹر سید ظفر الحسن صاحب۔ سید نذیر نیازی صاحب۔ مولوی سید محفوظ علی صاحب بدایونی۔ چودھری غلام احمد صاحب پرویز۔ مولوی سید عبدالرؤف شاہ صاحب ایم ایل اے (برار) مولوی عبدالرحمن خاں صاحب ایم ایل اے (برار)، جناب راغب احسن صاحب ایم اے وغیرہم۔

ان حضرات میں سے اکثر کو دعوت دی گئی کہ ۱۷ر شعبان (۱۲ر اکتوبر) کو مجوزہ ادارہ کے صدر مقام میں تشریف لاکر مجلس مشاورت میں شریک ہوں۔ اور بعض حضرات کی مشغولیتوں کا لحاظ کرکے صرف تفصیلی اظہار رائے کی تکلیف دی گئی۔ تاریخ مقررہ پر حسب ذیل حضرات مجلس مشاورت میں شریک ہوئے :۔

مولانا محمد منظور صاحب (بریلی)، جناب نذیر احمد صاحب قریشی (دہلی)، جناب عبدالعزیز شرقی صاحب (جالندھر)،
جناب مستری محمد صدیق صاحب (سلطان پور لودھی۔ ریاست کپورتھلہ)، جناب شیخ محمد نصیب صاحب بار اٹ لا (گورداسپور)
جناب چودھری رحمت علی صاحب (دینا نگر)، جناب شیخ محمد شریف صاحب طوسی بی اے (وزیرآباد)، جناب منظور احمد صاحب
بی اے (وزیرآباد)، جناب چودھری نیاز علی خاں صاحب۔ جناب سید محمد شاہ صاحب ایم اے۔ مولوی صدرالدین صاحب
اصلاحی۔ ابوالاعلیٰ مودودی۔

حسب ذیل اصحاب نے باہر سے اپنی آرا بصورت تحریر ارسال فرمائیں:۔

جناب محمد اشرف صاحب ایم اے (وزیرآباد)۔ ڈاکٹر سید ظفر الحسن صاحب (علی گڑھ)۔ چودھری غلام احمد
صاحب پرویز (شملہ)۔ جناب محمد یوسف صاحب (سیتاپور۔ اودھ)۔ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی۔ جناب اعجاز الحسن
صاحب ایم اے (کلکتہ)۔ جناب محمد اکبر خاں صاحب (کیمبلپور)۔ جناب حافظ منظر حسن صاحب (مغلپورہ)۔
جناب محمد شفیع صاحب باڑی (دہلی)۔

۱۷ سے ۱۹ شعبان تک تین روز مسلسل اجتماع رہا جس میں اسکیم اور دستور العمل پر ہر ممکن پہلو سے تنقید
کر کے زیادہ سے زیادہ صحیح اور منقح چیز حاصل کرنے کی کوشش کی گئی اور اس میں بیرونی اصحاب کی آرا سے بھی پورا استفادہ کیا گیا۔
بالآخر کافی ترمیم و اصلاح کے بعد دونوں مسودات اس شکل میں منظور کئے گئے جس میں اب وہ شائع کئے جا رہے ہیں۔
اس کے بعد پانچ اشخاص نے اپنے آپ کو رکنیت کے لئے پیش کر کے باقاعدہ حلف لیا جن کے نام یہ ہیں۔
(۱) مستری محمد صدیق صاحب (۲) سید محمد شاہ صاحب (۳) عبدالعزیز شرقی صاحب (۴) صدرالدین اصلاحی صاحب (۵) ابوالاعلیٰ مودودی۔
انہی پانچ ارکان سے مجلس شوریٰ کی ترکیب عمل میں آئی اور مجلس نے بالاتفاق طے کیا کہ جب تک چالیس
ارکان فراہم نہ ہوں اس وقت تک عارضی طور پر ابوالاعلیٰ مودودی فرائض صدارت انجام دے۔ مستقل صدر کا
انتخاب تعداد مقررہ کی فراہمی کے بعد عمل میں آئے گا۔

ابوالاعلیٰ مودودی (عارضی صدر ادارہ) ۲۱ شعبان ۵۷ھ

مقالات

واردھا کی تعلیمی اسکیم اور مسلمان

ایک عظیم الشان خطرہ سے آگاہی

(۲)

(منقول از رسالہ طلوعِ اسلام دہلی)

اس تفسیر کا اثر آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ وہی چیز جو کبھی دینِ الٰہی کی شکل میں سامنے آئی تھی، پھر وہ برہمو سماج کے رنگ میں نمودار ہوئی، اور جسے اب مہاتما گاندھی تعلیمی نصاب میں پیش کر رہے ہیں، لفظاً لفظاً وہی ہے جو مولانا آزاد نے اپنے دورِ قوم پرستی کی تفسیر میں بیان فرمائی ہے یعنی تمام مذاہب اپنی بنیادی سچائیوں کے اعتبار سے یکساں ہیں، فرق شریعتوں میں ہے اور شریعتیں کچھ اہمیت نہیں رکھتیں۔ اس بات کے اعلان کے لئے مہاتما جی نے اتنے عرصہ پیشتر سے زمین ہموار کرنی شروع کر دی تھی۔ چنانچہ ۱۹۳۱ء میں جب یہ تفسیر شائع ہوئی ہے تو مہاگاندھی نے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ایک تقریر فرمائی اور اس میں کہا کہ مجھے ایک عرصہ سے خیال تھا کہ اسلام ایسا تنگ نظر مذہب نہیں ہو سکتا کہ وہ نجات و سعادت کو اپنے پیرووں تک ہی محدود رکھے اور سچائیاں صرف اپنے اندر ہی تبلائے۔ لیکن مجھے اس بات کی سند کہیں سے نہ ملتی تھی۔ اب جو مولانا آزاد نے تفسیر شائع کی ہے تو مجھے اپنے

اس خیال کی سند مل گئی ہے کہ اسلام تمام مذاہب میں یکساں سچّائیوں کا مُدعی ہے۔ لہٰذا ہم نے اس تفسیر کے متعلقہ ٹکڑوں کا (ہندی) میں ترجمہ کر کے عام شائع کرایا ہے[1]۔"

اس کے بعد پانچ چھ برس تک مختلف قوم پرست مسلمانوں کی طرف سے اسی اسلام کا اعلان ہوتا رہا۔ ان کی طرف سے مضامین شائع ہوتے رہے۔ تقریریں ہوتی رہیں۔ جب یوں میدان صاف ہو گیا تو اب مہاتما جی نے اس نظریہ کو اپنی تعلیمی سکیم میں شامل کر دیا۔ اگر اتنی زمین ہموار کئے بغیر پہلے ہی یہ نظریہ مہاتما جی کی طرف سے پیش ہوتا تو مسلمان بدک جاتے لیکن مہاتما نے نہایت "حُسنِ تدبّر" سے اپنی مخصوص شاطرانہ چالوں سے مسلمانوں کے ذہن کو اس کے قبول کرنے کے لئے تیار کرایا، اور اس کے بعد اس کا اعلان کیا۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ آج خود مسلمان اس اسکیم پر اَحسنتَ و مرحبا کے نعرے لگا رہے ہیں۔

آپ کے علماء حضرات، جو کل تک آمین بلند و آہستہ کہنے پر ایک دوسرے کو کافر بتاتے رہتے تھے، جن کے نزدیک شریعت کے جزئیات تک کی اتنی اہمیت تھی کہ وہ ٹخنوں سے نیچے پاجامہ پہننے والے کو نجات و سعادت سے محروم قرار دیتے تھے، آج قوم پرست بننے کے بعد وہ اسلام کی اس جدید تعریف (Definition) کی رو سے اس شخص کو جسے کل تک وہ "کافر و مشرک" کہا کرتے تھے، اسی طرح نجات و سعادت کا مستحق قرار دیتے ہیں جس طرح مسلمان کو، بلکہ مسلمان کو وہ کھلی ہوئی گمراہی میں سمجھتے ہیں کہ یہ اپنی "مذہبی گروہ بندی" الگ قائم رکھنا چاہتا ہے، اور ہندوان کے نزدیک صحیح اسلام کا پیرو ہے جو ان گروہ بندیوں کو توڑ کر ایک متحدہ قومیت بنانا چاہتا ہے۔ ذرا خدا کے لئے پوچھئے کسی عالم سے، پوچھئے کسی فقیہ سے، پوچھئے کسی مولانا سے، پوچھئے کسی امیر شریعت سے کہ کیا فی الواقع اسلام وہی ہے جو مولانا آزاد نے اپنی تفسیر میں پیش کیا ہے؟ کیا ہندومت اور اسلام واقعی

[1] مسٹر مہادیو ڈیسائی سے ہمیں اطلاع ملی ہے کہ مولانا آزاد کی اس تفسیر کا ہندی ترجمہ بابو راجندر پرشاد (پٹنہ) سے مل سکتا ہے۔
"طلوعِ اسلام"

اپنی بنیادی سچائیوں کی رو سے بالکل یکساں ہیں؟ کیا مذاہب کے "ظواہر و رسوم" فی الحقیقت بیکار و مہمل ہیں کہ بچوں کو ان کی تعلیم دینا انہیں اصل دین سے بیگانہ کر دینا ہے؟ کیا واقعی شریعتِ محمدیہ کو نجات و سعادت میں کوئی دخل نہیں ہے؟ پوچھیئے ان سے کہ آج ان کی اس حمیتِ دینی کو کیا ہوا جو شریعت سے ذرا اختلاف کو برداشت نہ کر سکتی تھی؟ دریافت کیجئے ان سے کہ ان کے فتاویٰ کی اُن مہروں کو کون چرا کرلے گیا جو "ظواہر و رسوم" کے اختلافات کے فیصلوں کے لئے ہر وقت سجدہ ریز رہا کرتی تھیں؟ کس نے اُن کے قلموں کی سیاہیاں خشک کر دیں؟ کیا چیز آج اُن کے گلوگیر ہوگئی کہ یہ سب کچھ دیکھتے ہیں لیکن نہ کچھ لکھ سکتے ہیں نہ بول سکتے ہیں؟۔

آپ ایک دفعہ یہ تسلیم کر لیجئے کہ سچائیاں جو اصلِ دین ہیں ہر مذہب میں یکساں ہیں، اور شرائع جن میں اختلاف ہے وہ کچھ اہمیت نہیں رکھتیں، پھر اپنے آپ سے سوال کیجئے کہ یہ جو آپ کے علماء حضرات منبروں اور اسٹیجوں پر اسلام کی خصوصیات پر خطبے اور لکچر دیتے ہیں، ان کے کیا معنی رہ جاتے ہیں؟ کیا یہ سب کچھ، بقول مہاتما گاندھی صرف اس لئے کیا جاتا ہے کہ آپ محض سیاسی اغراض کی خاطر غیر مسلموں کو مسلمان بنانے کی کوشش کرتے ہیں؟ پھر پوچھیئے کہ جب آپ کے بچوں کو کامل سات برس تک جبری طور پر اس عقیدہ کی تعلیم دی جائے گی تو ان کے نزدیک اسلام میں کون سی کشش باقی رہ جائے گی جس کی خاطر وہ اِس سے متمسک رہیں؟ وہ بچہ جب ہندوؤں کو بھی اسی قسم کی سچائیوں کا حامل سمجھے گا، جس قسم کی سچائیاں قرآنِ کریم میں ہیں، تو وہ پھر مسلمان رہنے پر اصرار کیوں کرے گا؟ اُس ہندو قوم میں شامل ہونے سے کیوں احتراز کرے گا جس کے پاس مسلمانوں سے کہیں زیادہ دھن دولت بھی ہے اور عالمگیر سچائیاں بھی؟ لاکھوں بھنگی اور چمار (اچھوت) عیسائیوں کی مکتی فوج میں اس لئے شامل ہوگئے کہ ان کے اپنے مذہب میں انہیں کوئی تفوق نظر نہیں آتا تھا اور جس مذہب کی انہیں دعوت دی جاتی تھی وہ حاکم قوم کا مذہب تھا۔ کیا یہی چیز مسلمان بچوں کے ساتھ بھی نہ ہوگی؟ سوامی شردھانند

کی تحریک شدھی تو یونہی بدنام ہوگئی کہ وہ کھلے بندوں نام سے کر شدھی ہوتی تھی۔ مہاتما جی اس وقت منتسق ہوں گے کہ کیا دورِ جہالت کا سا طریق عمل اختیار کیا گیا ہے۔ مسلمانوں کو شدھ کرنے کا طریقہ اس سے جداگانہ ہے۔ انھوں نے اسی زمانہ سے خاموش شدھی کی اسکیم کا خاکہ تیار کر لیا جس کا سنگِ بنیاد مولانا آزاد کے مقدس ہاتھوں سے رکھوایا گیا، اور اب شیخ الجامعہ ملیہ اسلامیہ کے پاک ہاتھوں سے اس پر عمارت تیار کرائی جا رہی ہے!۔

کہا جا سکتا ہے کہ مسلمان اپنے بچوں کو مذہبی تعلیم نج کے طور پر دلائیں لیکن ذرا اس پر بھی غور فرمائیے کہ اسکول میں تو اسے پڑھایا جائے گا کہ تمام مذاہب اصولی طور پر یکساں ہیں اور گھر پر اسے پڑھایا جائے گا کہ اسلام دیگر مذاہب سے بلند و بالاتر مذہب ہے بلکہ خدا کا سچا مذہب ہے۔ یہی نہیں بلکہ پھر اسے گھر پر شریعت کی تعلیم بھی دی جائے گی، اور یہ وہ تعلیم ہوگی جس کی نسبت مہاتما جی نے فرمایا ہے کہ تمام لڑائی جھگڑوں کا باعث ہی یہ تعلیم ہے۔ تو یہ دونوں باتیں ساتھ ساتھ کیسے چلیں گی؟ یہ بھی واضح رہے کہ اسکولوں میں مذہبی تعلیم کتابوں کے ذریعے سے نہیں ہوگی اس لئے کہ مہاتما جی کو خوب علم ہے کہ وید کسی طرح قرآن کے سامنے لائے ہی نہیں جا سکتے۔ تعلیم ہوگی استادوں کی زندگی کے ذریعہ سے۔ اور ظاہر ہے کہ کانگریسی حکومت کے مقرر کردہ استاد کوئی ڈاکٹر اشرف کوئی جوش ہی ہوں گے جہاں وزیر تعلیم ڈاکٹر سید محمود جیسے ہوں جو مسلمانوں کا الگ نام رکھنا بھی ہندی قومیت کے خلاف سمجھتے ہیں[1]۔ وہاں کے استاد جس ڈھنگ کے ہوں گے وہ ظاہر ہے۔

باب دوم

فلسفۂ زندگی

مذہب کے متعلق تو آپ دیکھ چکے اب فلسفۂ حیات کو لیجئے۔ مسلمانوں کے نزدیک فلسفۂ زندگی مذہب سے الگ

---

[1] (ملاحظہ ہو سوراجی اسلام۔ مطبوعہ طلوع اسلام بابت جون)

نتے نہیں۔ یوں سمجھئے کہ مذہب جس رنگ میں انسان کو رنگنا چاہتا ہے وہی اس کا فلسفۂ زندگی ہوتا ہے۔ ہندو یوگیوں کا فلسفۂ حیات اہمسا ہے، جس کے معنی عدم تشدد (Non-violence) کئے جاتے ہیں لیکن عدم تشدد سے اس کا صحیح مفہوم ذہن میں منتقل نہیں ہو سکتا۔ اس سے مفہوم وہ فلسفۂ زندگی ہے جو حضرت مسیحؑ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے یعنی جو ایک گال پر طمانچہ مارے تو دوسرا گال بھی سامنے کر دو۔ ماحصل یہ کہ ہمیشہ مار کھائے جاؤ لیکن سامنے سے ہاتھ نہ اٹھاؤ۔ جب ہاتھ اٹھاؤ گے تو وہ ہمسا ہو جائے گا۔ قوت و طاقت کا استعمال ہمسا ہے اور مار کھاتے جانے کا طرز عمل اہمسا ہے۔ یہ وہ فلسفہ ہے جس کے "اوتار" آج مہاتما گاندھی سمجھے جاتے ہیں۔ اور وہ اس فلسفہ کو انسانیت کی بہترین تعلیم قرار دیتے ہیں۔ واردھا اسکیم جس کے متعلق دعویٰ یہ ہے کہ اس کو مذہب سے کچھ علاقہ نہیں فلسفۂ زندگی کے اعتبار سے اس کی بنیاد اہمسا پر رکھی گئی ہے۔ چنانچہ رپوٹ زیر بحث میں سب سے مقدم "بنیادی اصول" کے ماتحت لکھا ہے کہ "ہمارے بچوں کو یہ سکھانے کی ضرورت ہے کہ اہمسا کا طریقہ ہمسا سے اچھا ہے"۔ (رپورٹ صفحہ ۱۱) پھر "سماج کے علم" کے عنوان میں درج ہے:۔

"جن لوگوں نے قوموں کو آزاد کرایا ہے اور امن کے ذریعہ سے صلح حاصل کی ہے ان کی کہانیاں کورس کی کتابوں میں خاص طور پر ہونی چاہئیں۔ انسانوں کی زندگی سے ایسے سبق سکھانے چاہئیں جن سے اہمسا اور اس کے ساتھ کی خوبیوں کا ہمسا، دھوکے اور دغا سے اچھا ہونا ثابت ہو"۔ (صفحہ ۱۱۹)

ہمسا یا اہمسا ہمیں دیکھنا ہے کہ کیا قرآن کریم کی رو سے، اسوۂ حسنہ کی رو سے، صحابۂ کبارؓ کی حیات مقدسہ کی رو سے، مسلمان کے لئے فلسفۂ زندگی یہی ہے، جس کی تعلیم جبراً ان کے بچوں کو دی جائے گی؟ اس میں شبہ نہیں کہ اسلام امن و سلامتی کا مذہب ہے، وہ خواہ مخواہ دوسروں کو ستانے کی تلقین نہیں کرتا بلکہ اسے بڑی سختی سے روکتا ہے، وہ اپنے بیگانے سب کی عزت، عصمت، جان، مال، مذہب کی حفاظت کرنا سکھاتا ہے اور اس کے لئے وہ برائی کو بھلائی سے روکنے کا سبق دیتا ہے۔ (اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ)۔ لیکن اس کے نزدیک صرف اتنا حصہ فلسفۂ زندگی کا ایک شعبہ ہے۔ زندگی صحیح فطرت انسانی کی

مطابق نہیں ہو سکتی تاوقتیکہ اس عاجزی اور نرمی کے حصہ کے ساتھ دوسرا حصہ، اور نہایت اہم حصہ، شامل نہ ہو۔ یعنی وہ کہتا ہے کہ دنیا میں عفو، درگذر، نرمی، لینت، رواداری بڑے عمدہ اصول ہیں لیکن جب ایسا وقت آجائے کہ شریر النفس انسان دوسروں کی شرافت سے ناجائز فائدہ اٹھائیں اور کمزوروں اور ناتوانوں پر خدا کی یہ وسیع و عریض زمین تنگ کردیں، جب ایسا وقت آجائے کہ نرمی اور عاجزی، عفو اور درگذر سے ظالم کی سرکشی، اس کا ظلم و استبداد اور بڑھتا چلا جائے، تو اس وقت یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ دنیا میں عدل و انصاف قائم رکھنے کے لئے، قوانینِ الٰہی کی محافظت کے لئے، ظالم کے ظلم کو قوت سے روکو، اس کی سرکشی اور دراز دستی کو پوری طاقت اور زور کے ساتھ کچل کے رکھ دو اور اس کے تکبر و نخوت، اس کی فرعونیت اور نمرودیت کو چور چور کردو کہ اَلْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ۔ فتنہ و فساد، ظلم و استبداد، سرکشی اور طغیان، قتل سے کہیں زیادہ شر انگیز ہیں۔ جس انگلی پر ایسا ناسور ہو جائے جو ناقابلِ علاج ہو، اور اس کا زہر سارے جسم میں پھیل جانے کا اندیشہ ہو تو اس انگلی کا کاٹ کر پھینک دینا ہی عین مصلحت ہے۔ اگر آپ کو مظلوم کی حفاظت مقصود ہے تو ظالم کے ظلم کو ہر طرح سے روکنا ہوگا۔ اگر پرامن انسانوں کی عزت، عصمت، جان، مال کا تحفظ مطلوب ہے، تو قاتلوں کو حوالۂ دار و رسن کرنا ہوگا، مجرموں کو سزائیں دینی پڑیں گی، عدل و انصاف قائم کرنے کے لئے محکمۂ عدالت ناگزیر ہے، اور محکمۂ عدالت کے قیام و بقا کے لئے شمشیر جگردار کا ساتھ ہونا بھی لاینفک ہے۔ کوئی قانون ایسا نہیں جو دنیا میں قوت کے بغیر نافذ العمل ہو سکتا ہو۔ قرآن کریم نے اسی حقیقتِ کبریٰ کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:-

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيْزَانَ
لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ۔ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّ
مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ اِنَّ اللّٰهَ

قَوِيٌّ عَزِيزٌ ۝ ۵۷/۲۵

"ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتابیں یعنی قوانین عدل وانصاف نازل کئے تاکہ لوگ اپنے ٹھکانے پر اعتدال سے رہیں۔ اور (اس کے ساتھ ہی) ہم نے فولادی شمشیر (لوہے) کو بھی نازل کیا جس میں سخت قوتوں (کے راز) پوشیدہ ہیں اور لوگوں کے لئے (اور بھی) فائدے ہیں، تاکہ اللہ دیکھ لے کہ کون اس کی اور اس کے رسولوں کی بلا دیکھے مدد کرتا ہے۔ یقیناً اللہ بڑی قوت والا زبردست (غالب) ہے۔"

حضرت علامہؒ فرماتے ہیں:۔

سوچا بھی ہے اے مرد مسلماں کبھی تو نے کیا چیز ہے فولاد کی شمشیر جگر دار

اس بیت کا یہ مصرع اوّل ہے کہ جس میں پوشیدہ چلے آتے ہیں توحید کے اسرار

خدا کی کتاب یعنی قوانین الٰہی کے ساتھ ساتھ تلوار بھی نازل ہوئی ہے کہ لوگوں کو ٹھیک اپنے ٹھکانے پر رکھا جائے۔ جاوید نامہ میں حضرت علامہؒ، خاتونِ محترمہ شرف النساء کے متعلق تحریر فرماتے ہیں کہ اس نے وصیت کی تھی کہ اس کی قبر پر تلوار اور قرآن رکھ دیا جائے کہ:۔

ایں دو قوتؔ حافظ یک دیگر اند کائناتِ زندگی را محور اند ٭

مومناں را تیغ با قرآں بس است تربتِ ما را ہمیں ساماں بس است

آیت کے اخیر میں فرمایا کہ مسلمانوں کا خدا قویٌّ عزیز ہے۔ بے انتہا قوتوں کا مالک اور غالب وزبردست ہے، اس لئے اس کے رنگ میں رنگی ہوئی قوم بھی قوت وسطوت کی مالک ہونی چاہئے۔

سلہ تلوار قرآن کریم کی حفاظت کرنے والی ہے، یہ تو ظاہر ہے لیکن نکتہ بلیغ یہ ہے کہ قرآن کریم بھی تلوار کا محافظ ہے۔ تلوار کو اس محافظ کے بغیر آزاد چھوڑ دیا جائے، تو وہ تلوار چنگیز خاں، ہلاکو، کیزر، ہٹلر اور مسولینی بن جاتی ہے لیکن جب اس کے ساتھ قرآن محافظ ہو تو یہ عمرؓ و خالدؓ کی صورت اختیار کرتی ہے، اور دونوں میں فرق ظاہر ہے۔

اہنسا کی پرستار تو اس خدا کی قوم ہو سکتی ہے جو اس درجہ بے بس اور مجبور ہو کہ اس پر کوئی پتھر بھی پھینک دیا جائے تو وہ ہاتھ نہ اٹھا سکے۔ مٹی کے بت اور ایک خدائے حیّ و قیوم میں جتنا فرق ہے، اتنا ہی فرق اہنسا کے "اوتار" اور مردِ مجاہد میں ہے۔ مسلمان کا ہیولیٰ تو اہنسا اور ہمسا دونوں سے مل کر بنتا ہے

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان!

نبی اکرمؐ نے عفو و درگذر کا جو نمونہ اپنی حیاتِ مقدسہ میں پیش کیا اس کی نظیر دنیا کے کسی بڑے سے بڑے مُدعیِ امن و صلح کے ہاں نہیں مل سکتی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی جب قوت اور طاقت کے استعمال کی ضرورت پڑی تو کم و بیش دستر لڑائیوں (مغازی و سرایا) میں خود شمشیر بدست شریک ہوئے یا ان قدسیوں کی جماعت کو روانہ فرمایا جو دنیا میں انسانیت کی معراجِ کبریٰ کے مظہر اتم تھے۔ وہ مسلمان جن کے متعلق قرآنِ کریم کا ارشاد ہے:۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ۔ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ۝ ۹/۱۱۱

بے شک اللہ نے مومنین سے بعوض جنت اُن کی جانیں اور اموال خرید لئے ہیں اور (اس کا عملی ثبوت یہ ہے کہ) وہ لوگ اللہ کے راستے میں (میدانِ جنگ میں) لڑتے ہیں۔ سو یا تو دشمن کو تہِ تیغ کر کے (فاتح و مظفر لوٹتے ہیں) یا وہیں خاک و خون میں غلطاں ہو کر رسمِ شہادت کی بنیاد ڈالتے ہیں"

مومن کی تو شان یہ ہے کہ اگر دنیا قوانینِ الٰہی کے مطابق نہ چلے تو اس دنیا کو زیر و زبر کر دے، اس زمین و آسمان کو الٹ دے، اس جہانِ آب و گل کو درہم برہم کر دے۔

گفتند جہانِ ما۔ آیا بتو می سازد گفتم کہ نمی سازد۔ گفتند کہ درہم زن

مومن دنیا میں پانی کی طرح ہر قالب میں ڈھل جانے کے لئے نہیں پیدا ہوا، بلکہ یہ تو دنیا کو اپنے خدا کے وضع کردہ قالب میں ڈھالنے کے لئے پیدا ہوا ہے۔ اگر وہ پانی ہے تو خود بخود اس کے

قالب میں ڈھل جائے گی، ور اگر لوہا ہے تو اسے یہ اپنے جلال کی آتشِ سوزاں میں پگھلائے گا، تا آنکہ وہ مائع بن کر اس کے قالب میں ڈھل جائے۔ یہ دنیا میں قوانینِ الٰہی کا نافذ کرنے والا ہے۔ اگر شریف النفس انسان نہیں نرمی اور محبت سے مان لیں، تو اس سے بڑھ کر مہربان کوئی نہ ہوگا۔ لیکن اگر سرکش اور ضدی انسان اس قانون سے بغاوت کرے تو اس جیسا سخت گیر کوئی نہ ہوگا۔ مومن وہ ہے کہ:-

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ

اہنسا کا فلسفہ تو اُن کا ہے جو آسمان میں بجلی کڑکی تو اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوگئے، بادل گرجا تو اس کے سامنے سجدہ میں جھک گئے، سانپ دیکھا تو ڈنڈوت کرنے لگے، اپنے ہاتھوں سے بت تراشا اور اسے خدا بنا کر بیٹھ گئے۔ لیکن جو اس تمام کائنات کو مسخر کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہو، وہ اہنسا کا پرستار کیسے ہو سکتا ہے؟ (وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَمِيْعًا)۔ اہنسا تو ان کا فلسفہ ہے کہ جنہوں نے جب سے آنکھ کھولی اپنے آپ کو دوسروں کا غلام ہی دیکھا۔ لیکن جو بارہ برس کے اندر چالیس ہزار شہر اور قلعے فتح کرنے والی قوم ہو، اُس کو صرف اہنسا سے کیا واسطہ؟ نبی اکرمؐ سے دریافت کیا گیا کہ مومن کی زندگی کیا ہے۔ فرمایا کہ جب جہاد ہو رہا ہو تو وہ میدانِ جنگ میں ہو۔ اور جب نہ ہو رہا ہو تو اس کی تیاری میں مصروف ہو۔ میدانِ جہاد کا نقشہ تو آپ نے آیت مندرجہ صدر (وَيُقْتَلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ) میں دیکھ لیا۔ تیاری میں مصروف رہنے کے متعلق ارشاد ہے:-

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ ... الخ

"اور جس قدر قوت (وسامان) تم سے ہو سکے اُس سے اور پلے ہوئے گھوڑوں سے تم اپنے اور اللہ

کے دشمنوں (کے مقابلہ) کی تیاری رکھو تاکہ (اس قوت و شوکت سے) اُن پر
تمہارا رعب قائم رہے"۔

کہئے کہ وہ قوم جس کا رازِ حیات ان احکام کے اندر پوشیدہ ہو، اُس کا فلسفۂ زندگی اچھا ہو سکتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کا یہ فلسفۂ زندگی جس میں جمال کے ساتھ جلال کا عنصر بھی شامل ہے غیر مسلموں کے دل میں ہمیشہ سے کھٹکتا رہا ہے۔ کوئی ڈاکو کسی کوتوال کو اچھا نہیں سمجھ سکتا۔ اس لئے انھوں نے ہمیشہ یہ کوشش کی ہے کہ اس فلسفۂ زندگی کو گھناؤنا بنا کر دکھایا جائے، اس کی ایسی تصویر کھینچی جائے کہ جو دیکھے اس سے نفرت کرنے لگ جائے عیسائی مستشرق ایک عرصہ تک اس کی نشر و اشاعت کرتے رہے ہیں (اور اب بھی کر رہے ہیں)۔ نتیجہ اس پروپیگنڈا کا یہ ہوا کہ غیر تو غیر، خود مسلمان بھی اس قوت و شوکت کے فلسفۂ حیات کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگ گیا۔ گذشتہ پچاس برس سے آپ ہندوستان کے مسلمانوں کو دیکھیے، بالعموم جہاد کے مسئلہ میں وہ کچھ ایسے جھینپے ہوئے سے نظر آئیں گے، ان کا کچھ ایسا (Apologetic Attitude) ہوگا کہ اوّل تو ان کی خواہش یہ ہوگی کہ کسی طرح قرآن کریم سے یہ آیتیں خارج ہی ہو جائیں تو اچھا ہے، لیکن چونکہ اس پر ان کا بس نہیں چلتا اس لئے وہ آیات کی ایسی مضحکہ انگیز تاویلیں کرتے ہیں جن سے کسی طرح یہ ثابت ہو جائے کہ یہ اس زمانے کے احکام ہیں جس میں ابھی دنیا اتنی "مہذب" نہ ہوئی تھی۔ وہ دورِ وحشت و بربریت تھا۔ یہ احکام وقتی تھے۔ اُس زمانے کے مخصوص حالات کے ماتحت عربوں کی اس جنگجو قوم کے مقابلہ میں اس قسم کے طرزِ عمل کی ضرورت پڑ گئی لیکن اب یہ تمام آیات "منسوخ" ہو چکی ہیں۔ اور اب جہاد صرف "اشتہار نویسی" اور "مناظرہ بازی" کا نام رہ گیا ہے۔ اسی پروپیگنڈے کی تکمیل کے لئے قادیان میں ایک "نبی" "مبعوث" کرایا گیا اور اس نے فیصلہ ہی کر دیا کہ جہاد بالسیف اب قطعاً ممنوع ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ہ

ہو اگر قوتِ فرعون کی درپردہ مرید

قوم کے حق میں ہے لعنت وہ کلیمِ الٰہی

ایک مثال اس منظم سازش کے متعلق حضرت علامہؒ اپنی مثنوی اسرار و رموز میں تمثیلاً بیان فرماتے ہیں کہ کسی جنگل میں ایک شیر رہتا تھا۔ وہاں کی بھیڑیں جب اس سے تنگ آگئیں تو انھوں نے مل بیٹھ کر مشورہ کیا کہ اس آفت کا علاج کیا کیا جائے؟ ان میں جو سب سے زیادہ سیاستداں بھیڑ تھی اس نے کہا کہ دیکھو بھئی! اگر تم تمام بھیڑیں بھی اکٹھی مل جاؤ تب بھی ایک شیر نہیں بن سکتیں۔ لہذا اپنے آپ کو شیر بنانے کا خیال محض وہم ہے۔ البتہ کوشش یہ ہونی چاہئے کہ اس شیر کو کسی طرح بھیڑ بنا دیا جائے۔ چنانچہ اس بھیڑ نے گیروے رنگ کے کپڑے پہنے۔ ماتھے پر تلک لگایا۔ پاؤں میں کھڑاویں پہنیں۔ اور ایشور بھگتی، ایشور بھگتی کا منتر جپتی ہوئی شیر کی طرف چلی۔ شیر نے دیکھا کہ ایک دیوتا سروپ مہاتما چلا آرہا ہے۔ ڈنڈوت کیا اور پاس بیٹھ گیا۔ بھیڑ نے اشیرباد دی اور نہایت مسکین سی شکل بنا کر اپدیش دینا شروع کیا کہ بابا! یہ دنیا چندروزہ ہے، مایا کا جال ہے، یہ خونریزی اور گوشت خوری کی زندگی بھلے مانسوں کا کام نہیں، دشمن سے پریم کرو، اپنے آپ کو مارو، آتما کی شانتی اس سے حاصل ہوگی:-

ایکہ می نازی بذبح گوسفند	ذبح کن خود را کہ باشی ارجمند
زندگی را می کند ناپائدار	جبر و قہر و انتقام و اقتدار
غافل از خود شو اگر فرزانہ	گر ز خود غافل نہ دیوانہ
چشم بند و گوش بند و لب بہ بند	تا رسد فکرِ تو بر چرخ بلند

گوسفند کی یہ خواب آور فسوں سازی کارگر ہوگئی، اور شیر اس کا چیلہ بن گیا۔ اب ہنسا کی جگہ اہنسا کا فلسفہ اس کی زندگی کا طرزِ عمل تھا۔ گوشت چھوڑ کر گھاس پات پر گذران ہونے لگی۔ وہ قوت وہیبت، وہ تندی و تیزی، وہ جلال و جبروت مسکینی و عاجزی، کمزوری و ناتوانی، بزدلی و دوں ہمتی میں بدل گئی۔ رفتہ رفتہ یہ حالت ہوگئی کہ:-

از علف آں تیز ئی دنداں نماند — ہیبتِ چشمِ شرر افشاں نماند
دل تبدریج از میانِ سینہ رفت — جوہرِ آئینہ از آئینہ رفت
آن جنونِ کوششِ کامل نماند — آں تقاضائے عمل در دل نماند
اقتدار و عزم و استقلال رفت — اعتبار و عزت و اقبال رفت
پنجہائے آہنی بے زور شد — مردہ شد دلہا و تنہا گور شد
صد مرض پیدا شد از بے ہمتی — کوتہ دستی، بیدلی، دوں فطرتی

نتیجہ یہ کہ:۔ شیر بیدار از فسونِ میش خفت۔

اور قیامت یہ کہ:۔ انحطاطِ خویش را تہذیب گفت۔

ناصحانِ مشفق یہ گوسفندی ناصحانِ مشفق پہلے پادریوں کی صورت میں جلوہ فرما ہوا کرتے تھے، انگلستان سے چلتے تو اپنے اسلحہ بنانے والے کارخانوں کو تاکید کر آتے کہ دیکھنا تمہاری بھٹیاں کہیں ٹھنڈی نہ پڑ جائیں۔ ۱۶ سولہ انچ دہانے کی توپیں، چار چار من کے گولے، ڈھلتے چلے جائیں، لیکن مشرق میں مسلمانوں کو مسیح کی منادی سنائی جاتی کہ خدا کی بادشاہت کمزوروں، ناتوانوں اور ضعیفوں کا حصہ ہے۔ افیون کھا کر سو رہو تا کہ ملوکیت کے شکنجے اچھی طرح سے تم پر کسے جائیں۔ وہ ان کو آسمانی بادشاہت کے خواب اور افسانے سناتے رہے حتی کہ زمین کی بادشاہت یکسر دوسروں کے ہاتھ میں چلی گئی۔ وہ دور ختم ہوا تو وہی بھیڑ اب سادھو مہاتما کے چولے میں مسلمانوں کے سامنے اہنسا کا پرچار کرنے لگی۔ ڈاکٹر مونجے ملٹری کالج کھول رہے ہیں، بھائی پرمانند سنگھٹن کے اکھاڑے قائم کر رہے ہیں اور مہاتما گاندھی کا نازک دل انسانیت کے ظلم و ستم سے اس قدر متاثر ہو رہا ہے کہ سرحد کے پٹھانوں کو اہنسا کا سبق دینے جاتے ہیں:۔

شکایت ہے مجھے یا رب خداوندانِ مکتب سے

سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

"پٹھان کا ہوّا" بھارت ماتا کے سر پر جن کی طرح سوار تھا۔ اس کے دفعیہ کا یہی موثر طریقہ سمجھا گیا کہ اپنے ہاں ملٹری کالج کھولے جائیں اور وہاں کے "خان" کو "گاندھی" بنا کر ہاتھ باندھ کر ڈنڈوت کرنا سکھایا جائے اس کے بعد جو جبری تعلیم رائج کی جائے، اس میں بچوں کے دلوں پر یہ نقش ثبت کیا جائے کہ اہنسا کا نظریۂ زندگی ہمیشہ ہنسا سے اچھا ہوتا ہے۔ یہی نہیں۔ ہنسا کی برائیاں اچھی طرح سے واضح کی جائیں اور تاریخ عالم سے اُن مشاہیر کی کہانیاں پڑھائی جائیں جنھوں نے اہنسا کے ذریعے سے دنیا میں امن حاصل کیا ہے، یعنی مہاتما بدھ کی سوانح حیات اجاگر کر کے دکھائی جائے اور محمد رسول اللہ کی زندگی (نعوذ باللہ) گھناؤنی بتائی جائے۔ ہندوستانی غلاموں کا دستورِ حیات درخشندہ نظر آئے اور عمرؓ و خالدؓ کا طرزِ عمل (خاکم بدہن) مردود قرار دیا جائے۔ ذرا تصور میں لائیے اس وقت کو کہ آپ کے بچے سات برس کی عمر سے چودہ برس کی عمر تک اس تعلیم کے لئے مجبور کئے جائیں گے جس کی رو سے نبی اکرمؐ سے لے کر شاہ اسمٰعیل شہیدؒ تک تمام مجاہدینِ اسلام کا فلسفۂ حیات نفرت انگیز ہوگا اور اس کے برعکس ہندوستان کے تمام یوگی، سنیاسی اور ان کے سرخیل مہاگاندھی خدا کے اوتار سمجھے جائیں گے۔ غور فرمائیے کہ نتیجہ کیا ہوگا؟ ہندوؤں کی تو سلطنت ہوگی، اس لئے اس کے بچوں کو اہنسا پڑھائیے یا ہنسا، اس سے کچھ فرق نہیں پڑے گا، بلکہ اہنسا سے ان کے دلوں میں اپنے بزرگوں کی عزت، اپنے مذہب کی عظمت اور مسلمانوں کے مشاہیر سے نفرت اور ان کے مذہب سے حقارت کے جذبات پیدا ہوں گے۔ لیکن غور فرمائیے کہ مسلمان بچوں کی ذہنی اور قلبی کیفیت کیا سے کیا بن جائے گی؟۔

مہاتما جی کس قدر معصومانہ انداز سے فرماتے ہیں کہ موجودہ انداز پر مذہبی تعلیم سے چونکہ اختلافات بڑھتے ہیں، اس لئے مذہبی تعلیم کو واردھا اسکیم سے خارج کر دیا گیا ہے۔ لیکن ان سے کوئی پوچھے

کہ اہنسا کی خوبیاں اور ہنسا کی برائیاں بتانے سے کوئی اختلاف نہ پیدا ہوگا؟ اس "مہا تمیت" کے چھلکے کو اتار دیجئے تو نیچے سے صاف نظر آجائے گا کہ مقصد اصلی کیا ہے؟ مقصد یہ ہے کہ مذہبِ اسلام کی تعلیم جبراً روک دی جائے اور اس کے بجائے ہندو مت کی تعلیم عام کر دی جائے۔

اعترافِ حقیقت تنہا اہنسا اور اسلامی تعلیم میں اتنا کھلا ہوا فرق ہے کہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب پچھلے دنوں جب واردھا اسکیم کے سلسلہ میں شملہ تشریف لائے تو انھوں نے اسکیم کے متعلق صندل ہال میں تقریر فرمائی۔ تقریر کے بعد ایک پرائیوٹ صحبت میں اُن سے اہنسا اور اسلامی فلسفۂ حیات کے متعلق کچھ سوالات کئے گئے تو انھوں نے دو ہی قدم پر جا کر کھلے الفاظ میں اقرار کر لیا کہ فی الواقع یہ غلطی ہے۔ اسلام کا فلسفۂ زندگی صرف اہنسا نہیں بلکہ ہنسا اور اہنسا دونوں کا امتزاج ہے۔ اب پتہ نہیں کہ جناب ڈاکٹر صاحب اس غلطی کا اعلان بھی فرماتے ہیں یا نہیں۔ لیکن ہم تو بالکل واضح الفاظ میں اعلان کر دینا چاہتے ہیں کہ اسلام نرمی اور انکساری کے ساتھ ساتھ سختی اور درشتی کا بھی مذہب ہے۔ یہ جلال اور جمال کا مذہب ہے۔ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ بھی اسی خدا کا حکم ہے جس کا حکم رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ ہے۔ فَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ (فتنہ پردازوں کو جہاں پاؤ کچل دو) بھی اُسی خدا کا ارشاد ہے، جس کا ارشاد فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا (معاف کرو اور درگذر کرو) ہے۔ مسلمان کو حکم ہے کہ:

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا

گذر جا بن کے سیل تند رُو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جُوئے نغمہ خواں ہو جا

یہ ہے وہ تعلیم جو اُن بچوں کے شایانِ شان ہے جو تیغوں کے سائے میں پل کر جوان ہوتے ہیں۔ نہ کہ اہنسا کی خود فریبی۔ ہمیں اس سے بحث نہیں کہ ہندوستان میں مسلمان کی آج کیا حالت ہے۔ ہمیں تو اس سے غرض ہے کہ وہ مذہب جسے مسلمان خدا کا سچا مذہب سمجھتا ہے اس کی تعلیم کیا ہے۔

اب ذرا سماج کے علم کے ان دو ٹکڑوں کو ملائیے۔

(۱)، تمام مذاہب، اسلام اور ہندو مت۔ اصولی طور پر یکساں ہیں کسی کو دوسرے پر تفوق نہیں۔

(۲)، فلسفۂ زندگی کے اعتبار سے اہسا کو ہما پر فضیلت ہے۔

فرمائیے نتیجہ کیا نکلا؟ اس پر اعلان ہو رہا ہے کہ یہ اسکیم مشترکہ تعلیم کی اسکیم ہے۔ اسے کسی مذہب کی تعلیم سے واسطہ نہیں۔ اللہ اکبر! کس قدر کھلا ہوا فریب!!

بنیادی نقش "سماج کے علم" کی ایک اور شق میں تحریر ہے کہ "تعلیم ایسی دی جائے جس سے بچے کے دل میں وطن کی محبت پیدا ہو۔ وہ ہندوستان کے پچھلے زمانہ کی عزت کرے" (رپورٹ ص۱۱)

بجا! مذہب کے اعتبار سے اسلام اور ہندو مت یکساں۔

فلسفۂ زندگی کے اعتبار سے اہسا کو ہما پر فوقیت۔

اس کے بعد، ہندو مذہب اور ہندو فلسفہ کا جس عہد میں زور تھا اس زمانے کی عزت بھی بچے کے دل میں بٹھا دی جائے۔

اس طرح متحدہ قومیت کی تشکیل ہوگی۔ الگ الگ مذہب کی تعلیم چونکہ لڑائی جھگڑے کا موجب ہوتی ہے اس لئے اہسا کے وِدیا مندر میں اس کا گذر کیوں ہو؟ ان جھگڑوں کے مٹانے کا واحد علاج یہ ہے کہ تعلیم ایسی دی جائے جس کی رو سے ہندو فلسفۂ زندگی کی عظمت اور ہندو دورِ تہذیب کی عزت دلوں میں نقش ہو جائے۔ اسلام کے فلسفۂ زندگی کی مذمت اور اس فلسفہ کے علمبرداروں کی طرف سے دل میں نفرت پیدا ہو جائے۔ جھگڑے خود بخود مٹ جائیں گے۔ جھگڑے تو اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب ہندو سمجھتا ہے کہ اسلام اور مسلمان صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کے لائق ہیں اور مسلمان ایسا سن نہیں سکتا لیکن جب ہندو اور مسلمان دونوں بچے اس باب میں متفق اللسان ہوں گے کہ ہاں واقعی اسلام کا فلسفۂ حیات اور اس کے علمبردار انسانیت کے سب سے بڑے دشمن ہیں تو پھر جھگڑا کیسے پیدا ہوگا؟ جب سر ہی نہ رہے گا تو سر درد کہاں ہوگا؟۔

یہ ہے وہ "اندرونی روشنی" جو نوعِ انسانی کے اُس "مصلحِ اعظم" کو براہِ راست "خدا" کی طرف سے ملتی ہے جس کے دل میں تمام مذاہب کے پیرووں کے لئے "جذبہ ہمدردی" یکساں موجزن ہے! یہ اُس دیش کے مہاتما ہیں جس کے "ہیرو" کا سب سے بڑا کارنامہ یہ گنا یا جاتا ہے کہ جب وہ افضل خاں سے صلح و محبت کا معانقہ کرنے کے لئے آگے بڑھا تو ذیرِ آستین تیز، نوکدار، آہنیں، پنجہ چھپا رکھا تھا جو اس دوست سے بغلگیر ہونے پر اس کے قلب و جگر میں پیوست کر دیا گیا۔ اس دیش کے مہاتما سے آپ کس قسم کے سلوک کی توقع رکھ سکتے ہیں!۔

عاقبت گرگ زادہ گرگ شود   گرچہ از آدمی بزرگ شود

جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نے شملہ کی اس پرائیوٹ صحبت میں جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے فرمایا تھا کہ "پچھلے زمانے" سے ان کی مراد صرف ہندووں کا زمانہ ہی نہیں بلکہ اس میں مسلمانوں کا زمانہ بھی شامل ہے لیکن جب یہ عرض کیا گیا کہ مسلمانوں کے زمانہ میں تو اہنسا کے علمبردار ہی نظر آئیں گے۔ اس زمانہ کی عزت بچے کے دل میں کیسے بٹھائی جائے گی؟ تو انھوں نے فرمایا کہ اس زمانہ کے صوفیائے کرام کے حالات بتلائے جائیں گے جنھوں نے اہنسا کے مطابق زندگی بسر کی ہے۔

ہم اس وقت اس بحث میں الجھنا نہیں چاہتے کہ وہ حضرات جن پر حقیقی معنوں میں "اولیاء اللہ" کا لقب صادق ہوتا ہے، وقت آنے پر وہ کس طرح تسبیح و مصلیٰ کے ساتھ ساتھ شمشیر و سنان کو بھی عین اسلام سمجھتے تھے لیکن ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے اندر بھی خوبی صرف اسی چیز میں رہ گئی ہے جو ہندووں کے نظریہ زندگی کے مطابق ہو۔ اسلام کا دوسرا حصہ یعنی مجاہدانہ حرارت کا شعبہ چونکہ اہنسا کے نظریہ کے مطابق نہیں ہے، اس لئے اس میں برائیاں ہی برائیاں ہیں۔ یہ ہے عملی تفسیر (یُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتَابِ وَیَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ) کی یعنی قرآن کے اُتنے حصے پر ایمان جو اپنے نظریے کے مطابق ہو اور باقی حصہ سے انکار۔

بابِ سوم

زبان کا مسئلہ

اس کے بعد زبان کا مسئلہ آتا ہے۔ "ہندوستانی" زبان نصاب میں لازمی رکھی گئی ہے (رپورٹ صفحہ ۱۲۳) زبان کا مسئلہ اس قدر اہم ہے کہ اسے ضمنی طور پر چھیڑا نہیں جا سکتا۔ یہ مضمون بہت طویل ہو رہا ہے، اس لئے ایسے اہم سوال پر ہم کسی دوسری صحبت میں مفصل بحث کریں گے۔ انشاء اللہ۔ مگر اتنا یاد رہے کہ کسی قوم کی موت وحیات کا سوال اس قوم کی زبان اور اس کے رسم الخط سے وابستہ ہوتا ہے۔ مسلمان اس کی اہمیت سے ناواقف ہیں۔ اور ہندو چپکے ہی چپکے وہ سب کچھ کیے جا رہے ہیں کہ جب اس کے نتیجہ پر نگاہ پہنچتی ہے تو روح کانپ اٹھتی ہے کہ یا اللہ مستقبل قریب میں مسلمانوں پر یہاں کیا کچھ گذرنے والا ہے۔ اس وقت تو اتنا دیکھیے کہ ہندوؤں کی اس تحریک کا اثر کہ "ہندوستانی" زبان سے عربی و فارسی کے "غیر مانوس" الفاظ کو نکال دینا چاہیے کس قدر سرعت سے پھیلتا جا رہا ہے۔ رپورٹ زیر نظر میں انگریزی الفاظ تو جگہ جگہ آپ کو ملیں گے۔ مثلاً ٹریننگ، کورس، پالیسی، نارمل، ورنیکلر وغیرہ۔ لیکن عربی اور فارسی کے اُن الفاظ کے بجائے جنھیں سمجھنے میں کسی اردو داں کو بھی دقت نہیں ہو سکتی، ایسے الفاظ ٹھونسے گئے ہیں جنھیں، نہ عبارت کی روانی قبول کرتی ہے، نہ مذاقِ سلیم۔ حالانکہ بعض غیر عربی الفاظ بجائے خویش ایسے غیر مانوس استعمال کئے گئے کہ اردو داں طبقے نے شاید ہی کبھی سنے ہوں۔ مثلاً نئی سماج کا ڈول ڈالے جس کی نیو ہمدردی پر رکھی گئی ہو۔ پچھم کے ملکوں میں۔ کسی مفید سیوا کے ذریعے۔ دھیرے دھیرے اتنی مشق ہو جائے۔ جس کی نیو..... نیائے پر رکھی جائے.. وغیرہ۔ کہیے کہ طرح ڈالنا، بنیاد، مغرب، خدمت، آہستہ آہستہ، انصاف، ان میں کونسا لفظ ایسا ہے جو عام فہم نہیں؟ ان کی جگہ خواہ مخواہ "پوربیوں کی بولی" گھسیٹ لانا

اس بات کی کھلی کھلی غمازی کر رہا ہے کہ ہر بات میں ہندوؤں کی خوشنودی کا جذبہ کس قدر غالب آرہا ہے۔ یہ اگر "مرعوبیت" نہیں تو اور کیا ہے۔

بابِ چہارم

معاشرت

اب مقطع کا بند سنیے۔ ارشاد ہے۔

"گانا۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ بچوں کو اچھے گیت یاد ہو جائیں اور انہیں اچھے گانے کی پہچان اور شوق ہو جائے۔ بچوں میں تال کا جو قدرتی احساس ہوتا ہے اسے ترقی دینے کے لئے انہیں دونوں ہاتھوں سے تالی دینا سکھایا جائے" (ص ۱۲۳)

آپ کو معلوم ہے کہ اچھے برے گانے کی پہچان کے لئے کس قدر راگ ودیا کی ضرورت ہوتی ہے، اور پھر سر تال سے سیکھنے کے لئے اور کیا کچھ سیکھنا پڑتا ہے۔ رقص و سرود ہندوؤں کی پرچین تہذیب کا ایک ضروری جزو ہے۔ ڈاکٹر ٹیگور کو آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہ با ایں ہمہ ریش و فش نوجوان لڑکیوں کو ساتھ لے کر شہر شہر ناچ اور گانے کا تماشا دکھاتے پھرتے تھے۔ اودے شنکر اور اس کی پارٹی رقص و سرود کے ذریعے "کرشن لیلا" کی یاد تازہ کرتے پھرتے ہیں۔ ہندو کنیا مہاودیالوں میں راگ وغیرہ نصاب میں داخل ہے۔ لہٰذا اگر ہندو لڑکے اور لڑکیوں کے لئے راگ کا نصاب رکھا جائے تو انہیں عین مسرت ہوگی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ چودہ برس کی عمر میں مسلمان لڑکیوں کو راگ اور تال سکھا کر کیا بنانا مقصود ہے؟ حضرت اکبر مرحوم نے فرمایا تھا کہ

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر ۔۔۔ خاتونِ خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں
دین دار متقی ہوں جو ہوں ان کو منصرم ۔۔۔ استاد اچھے ہوں مگر استاد جی نہ ہوں

مسلمانو! ذرا غور سے دیکھو کہ آزاد ہندوستان میں جبری تعلیم کی رو سے آپ کی بیٹیاں اور بہنیں کس قسم کی تعلیم حاصل کیا کریں گی؟

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

نتائج مستخرجہ

علتِ مرض | یہ ہے مختصراً واردھا اسکیم جو مہاتما گاندھی کے مجلۂ دماغ سے نکل کر جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کی مساعیٔ جمیلہ کے صدقے مسلمانوں کے بچے اور بچیوں کے لئے جبری تعلیم کا نصاب بننے والی ہے۔ شملہ میں اسکیم پر آخری مرتبہ غور و خوض ہو چکا ہے۔ اور اس کے بعد یہ نافذ العمل ہو جائے گی۔ مسلمانوں نے دیگر اہم مسائل کی طرح تعلیمی مسائل میں بھی ہمیشہ بے رخی برتی ہے جس کا نتیجہ ان کے سامنے ہے۔ لیکن وہ یاد رکھیں کہ اگر انھوں نے اس مرتبہ بھی ایسا ہی کیا تو پچاس برس کے اندر وہ دیکھیں گے کہ ان کا ہندوستان میں وہی حشر ہوگا جو اسپین میں ہوا تھا۔ اور پھر یہ ڈھونڈیں گے کہ وہ قوم کیا ہوئی جو اپنے آپ کو مسلمان کہا کرتی تھی لیکن یہ سب باتیں فروعی ہیں۔ اصل نقص کہیں اور ہے۔ یہ تو یوں سمجھیے کہ یہاں پھوڑا نکل آیا۔ وہاں پھنسی ہو گئی۔ کہیں خارش نمودار ہو گئی۔ کہیں جنبل پھوٹ نکلا۔ یہ امراض نہیں ہیں بلکہ علاماتِ مرض ہیں۔ علتِ مرض یہ ہے کہ خون خراب ہو چکا ہے۔ ان پھوڑے پھنسیوں کا علاج مرہم سے نہیں ہوگا۔ خون صاف کر دینے سے ہوگا۔ یہ واردھا اسکیم، یہ مخلوط طریق انتخاب، یہ ہندی اردو کے جھگڑے، سب علاماتِ مرض ہیں۔ اصل مرض یہ ہے کہ ہندو ہندوستان میں ایک "متحدہ قومیت" بنانا چاہتے ہیں تاکہ مسلمان اپنی ملی خصوصیات کھو کر کانِ نمک میں پہنچکر نمک بن جائیں۔ جب تک آپ اس بنیادی اصول کو پاش پاش کر کے نہ رکھ دیں گے آپ کے کسی مرض کا علاج نہیں ہو سکتا۔ مسلمان ہندوستان میں ایک الگ قوم کی حیثیت سے

رہے گا۔ اس کی الگ جماعتی زندگی ہوگی۔ اور جب قوم الگ ہوگی تو پھر اس کی زبان بھی اپنی ہوگی۔ تہذیب بھی الگ ہوگی۔ مذہب بھی الگ ہوگا اور تعلیم بھی الگ ہوگی۔ نہ ان کی مشترکہ قومیت ہو سکتی ہے اور نہ مشترکہ تعلیم۔ ہندوؤں سے کہئے کہ وہ اپنے بچوں کے لئے تعلیمی اسکیمیں تیار کرتے رہیں۔ انہیں کیا حق حاصل ہے کہ مسلمان بچوں کے لئے تعلیمی تجاویز سوچتے پھریں، اور پھر ان پر انہیں جبراً عائد کردیں، اور اس طرح جو کام سوامی شردھانند نے اٹھایا تھا اور جو پروان نہ چڑھ سکا اسے مہاتما گاندھی پورا کردیں۔

ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے

ہمیں یقین ہے کہ مسلمانوں کے لئے جو مہلک اثرات اس اسکیم کے اندر چھپا کر رکھے گئے ہیں، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کی نگاہوں کے سامنے وہ بے نقاب ہو کر نہیں آئے اور انھوں نے اس کو محض سطحی اور عمومی نظر سے دیکھا ہے، ورنہ یہ باور کرنے کو جی ہی نہیں چاہتا کہ جناب ڈاکٹر صاحب دیدہ و دانستہ ہندوؤں کی چھری سے یوں مسلمانوں کے بچوں کو اپنے ہاتھوں سے ذبح کرنے پر تلے بیٹھے ہوں۔ خدا کرے کہ اس اسکیم کے ساتھ ان کی تائید غلط فہمی پر مبنی ہو، اور جس طرح انھوں نے شملہ میں اہمسا کے متعلق اپنی غلطی کو تسلیم کیا تھا، اسی طرح وہ باقی اسکیم کے متعلق تفصیلات بالا کی روشنی میں غور فرما کر اس سے اپنی بریت کا اعلان فرمادیں۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اس اسکیم کا ان کے نام سے انتساب ملتِ اسلامیہ کا قتل نہیں تو اعانتِ قتل کے جرم سے انہیں کبھی بری نہیں قرار دے سکے گا۔

(تکملہ) یہ مضمون پریس میں جاچکا تھا کہ مہاتما گاندھی کا ذیل کا بیان اخبارات میں شایع ہوا۔

"مختلف طبقات و مذاہب کے بچوں میں رواداری اور دوستی کی جو روح پیدا ہورہی ہے میں اس کے پیشِ نظر اس بات کو سخت مہلک اور خطرناک سمجھتا ہوں کہ ان کو یہ سکھایا جائے کہ ان کا مذہب دیگر تمام مذاہب پر برتری رکھتا ہے یا جس مذہب کے وہ قائل ہیں ان کے نزدیک بس وہی مذہب سچا ہے۔ اگر یہ تفرقہ انگیز روح قوم میں سرایت کر گئی تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر فرقہ کا علحدہ

اسکول ہو جس میں ہر ایک کو دوسرے کی مذمت کرنے کی پوری آزادی حاصل ہو۔ یا پھر ایسی درسگاہوں میں مذہب کے تذکرہ کو بالکل ہی ممنوع قرار دیا جائے (اسٹیسمین ۱۷ جولائی ۱۹۳۸ء صفحہ ۱۰ کالم ۲) (نیز ہندوستان ٹائمز، ۱۷ جولائی ۳۸ء)

دیکھ لیجئے جس چیز کی طرف ہم نے اپنے مضمون میں اشارہ کیا تھا وہ لفظاً لفظاً سامنے آگئی یا نہیں! اور ابھی، آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا! جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں مہاتما گاندھی کا مسلک شیر کا مسلک نہیں جو بے نقاب گرجتا پھرتا سامنے آجائے، بلکہ ان کا مسلک ہمیشہ گھات میں رہنے کا ہے، اور مسلمانوں کی تباہی کے معاملات میں تو وہ خاص طور پر شاطرانہ چالوں سے کام لیتے ہیں۔

پھر یہ بھی دیکھ لیجئے کہ جو کچھ مہاتما جی چاہتے ہیں وہ لفظاً لفظاً وہی ہے جو مولانا آزاد نے اپنی تفسیر میں پہلے ہی سے لکھ رکھا ہے اور اس طرح مہاتما گاندھی کے مقصد کے حصول کے لئے پہلے ہی سے زمین تیار کر کے چھوڑی ہے۔

اندازہ فرمائیے کہ جب مسلمان بچوں کو یہ سمجھا دیا جائے گا کہ دیگر مذاہب بھی اسلام کی طرح سچے اور خدائی مذہب ہیں تو پھر اسلامی قوانین کی حفاظت، اسلامی تمدن و تہذیب کی حفاظت اور اسلامی حقوق کی حفاظت کا سوال ہی پیدا نہ ہوگا۔ اگر صحابہ کرامؓ کو مذہب کا یہ فلسفہ معلوم ہوتا، اگر خالد بن ولیدؓ، عمرو بن العاصؓ اور سلطان صلاح الدین کو اپنے زمانہ میں کوئی گاندھی مل جاتا تو آج اسلام کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔ یعنی سرے سے اسلام کا وجود ہی نہ ہوتا اور مسلمان بہت جلد اس کیمیاوی عمل سے تحلیل ہو کر فنا ہو جاتا۔ لیکن مہاتما گاندھی یا اور ہندوؤں کا کیا گلہ؟ ان کو تو مسلمانوں سے انتقام لینا ہے اور اس کے لئے وہ ہر حربہ استعمال کریں گے۔ رونا تو آتا ہے ان مسلمان اکابر پر جو ان کے مقاصد کے حصول میں اس قدر "جہادِ عظیم" میں مصروف ہیں۔ از باغباں شند است کہ صیاد نہ آں کرد۔

معرکۂ اسلام وجاہلیت

بَدَأَ الْاِسْلَامُ غَرِیْبًا وَّسَیَعُوْدُ غَرِیْبًا

(۶)

از جناب مولوی صدرالدین صاحب اصلاحی

جنگ و جہاد اور صلح و معاہدہ کے متعلق اسلامی تعلیمات کی اخلاقی رفعت، حدود نظر سے آج بھی اسی قدر ماورا ہے جس قدر قرونِ مظلمہ میں تھی۔ آج کسی مہذب ترین سلطنت سے کہو کہ دشمن سے اس وقت بھی صلح کرنے میں پس و پیش نہ کرو جب وہ مغلوب اور تم غالب ہو، امن پسندی اور انسانیت کا تقاضا ہے کہ حریف کو تم خود اس وقت صلح و آشتی کی دعوت دو جب اس کے بازو تھک کر چور ہو چکے ہوں، اس کی جنگی تدبیریں نامراد اور حوصلے پست ہو رہے ہوں، اور فتح و کامرانی ہر طرف سے تمہیں کو ڈھونڈھ رہی ہو، پھر جب تم اس سے صلح کر لو اور تمہارے درمیان معاہدہ ہو جائے تو خبردار مدتِ معاہدہ ختم ہونے سے پہلے اس کی کسی دفعہ کی خلاف ورزی نہ کرو، حتیٰ کہ اگر تمہارے عزیزوں قرابت داروں، اور دینی بھائیوں کے خلاف بھی وہ دشمنِ معاہد صف آرا ہو اور معاہدہ ان لوگوں کی حمایت اور مدافعت کرنے کی اجازت نہ دیتا ہو تو تم معاہدہ کی حرمت پر سب کچھ قربان کر دو کہ دنیا کی ساری متاع کھو کر انسان کچھ نہیں کھوتا مگر اخلاق اور انسانیت کھو کر سب کچھ کھو دیتا ہے۔ یہ باتیں سن کر آج اس سطح ارض پر بسنے والی کوئی "متمدن" قوم تمہیں سلیم العقل اور باہوش انسان تسلیم کرنے

کے لئے تیار نہ ہوگی۔ اس کی سمجھ میں نہ آئے گا کہ شکست کھانے والا فریق صلح و مسالمت کی پیش کش کرے تو کرے لیکن فاتح اور غالب سے یہ توقع کس طرح کی جا سکتی ہے؟ اونچے سر کا جھکنا کس قدر عجیب بات ہے!

آج تم ہر دنیوی مقصد کے لئے تلوار اٹھا سکتے ہو اور انسانی خون بہا سکتے ہو۔ تمھارے لئے جائز ہے کہ چین کو افیون کھلانے کے لئے فوجیں لے کر چڑھ جاؤ۔ تم اپنی سلطنت کے راستوں کی حفاظت کے لئے جبرالٹر سے ہانگ کانگ تک ہر ملک اور ہر قوم کو غلامی کی زنجیریں پہنانے میں حق بجانب ہو، اور اس غرض کے لئے فلسطین کی سرزمین کو لالہ زار بھی بنا سکتے ہو۔ تمھیں اس کا بھی حق ہے کہ خام پیداوار حاصل کرنے اور اپنی تجارت کے لئے نئی منڈیاں تلاش کرنے کے لئے جس ملک پر چاہو حملہ کر دو۔ تم وطن اور قوم اور بادشاہ کے نام پر بھی لڑنے کے حق دار ہو۔ لیکن اگر تم نے خدا کے نام پر تلوار اٹھائی اور زمین میں خدا کا کلمہ بلند کرنے کے لئے جنگ کی تو تم سے بڑھ کر وحشی، مذہبی دیوانہ، خونخوار درندہ اور کوئی نہیں

یہ ہے جاہلیت جدیدہ کا فلسفۂ جنگ!۔

آج تم (نعوذ باللہ) خدا کی الوہیت و حاکمیت کا انکار کر دو، جاہلیت تم پر مرحبا و آفریں کے پھول برسائے گی۔ نبوت، وحی اور شریعت کا استخفاف کرو، تہذیب تمھیں مدبر، مفکر، فلسفی اور حکیم کا خطاب دے گی۔ دامن عفت و انسانیت کے پرزے اڑا دو زمانہ تمھیں روشن خیالی کا دیوتا کہہ کر پکاریگا۔ لیکن اگر تم نے وطنیت اور قومیت کے بتوں کو سجدہ کرنے سے انکار کیا تو پھر تم اپنی بخشش کیلئے کوئی راہ نہیں پا سکتے۔ کفار قریش نے نبی صلعم سے متعجبانہ گلہ کیا تھا کہ اپنی قوم کا خون بہا کر تم کیونکر سرخرو ہو سکتے ہو۔ عبداللہ ابن اُبَی حیرت سے بے خود اور وفور غیظ سے بے تاب تھا کہ کٹے سے آئے ہوئے غیر ملکی ہماری یثربی قومیت اور وطنیت کی بے حرمتی کر کے کس طرح بھائی کو بھائی سے لڑا رہے ہیں۔ لیکن آج جبکہ علم و حقیقت کی کرنیں دور جاہلیت کی تمام جہالتیں آشکار کر چکی ہیں اور تہذیب زمانہ ہر اس چیز کو جس پر قدامت کا "داغ" لگا ہوا ہے مردود قرار دیکر ان جہالتوں

پر مغرورانہ ہنس رہی ہے، آپ کو معلوم ہے کہ داعی اسلام کا سب سے بڑا قصور اور (نعوذ باللہ) وحشیانہ فعل کیا ہے؟ اس کا جواب فرانس کے مشہور ادیب سیاست داں والٹیر کی زبانی سنیے۔ نہایت متعجب ہو کر کہتا ہے۔

"میں وغیرہ کو آخر عرب کے اس شتربان (روحی فداہ) میں عظمت کا کونسا پہلو نظر آیا؟ قوم نے سردار منتخب کیا ہوتا یا اپنے ملک اور وطن کی حمایت میں اس نے اغیار سے جنگ کی ہوتی تو خیر ایک بات بھی تھی لیکن جو شخص خدا کے نام کو آڑ بنا کر خود اپنے ملک والوں سے جنگ کرے، اسے کوئی اچھا کس طرح کہے"

"نئی روشنی" اور "پرانی جہالت" کا موازنہ کر کے نتیجہ نکال لیجئے۔

زمانہ کے موجودہ نظام معاشرت کو دیکھتے ہوئے ہم اندازہ نہیں کر سکتے کہ وہ اسلام کے معاشرتی نظریات اور تصورات سے کس قدر متوحش اور بیگانہ ہوگا۔ سوسائٹی کا اسلامی نظام عفت عصمت، حیا، پاکیزگی اور اخلاق کی بنیادوں پر رکھا گیا ہے۔ مرد و عورت کے فرائض ان کی فطری خصوصیات کے مطابق الگ الگ متعین کئے گئے ہیں، کیونکہ ان میں سے ایک سراپا فعل ہے، دوسرا مجسم انفعال۔ گویا یہ دونوں صنفیں ایک گاڑی کے دو پہیے ہیں جو ایک خاص تعامل کے ذریعہ نظام انسانی کو برقرار رکھ سکتے ہیں۔ مرد کو اس گاڑی کا نگراں بنایا گیا ہے۔ انسانی ترقی کا راز انہیں دو قوتوں کے باہمی تعاون اور فرائض خصوصی کے امتیاز پر منحصر ہے۔ اسی بنیادی تخیل کے ماتحت نکاح، طلاق، پردہ، تعدد ازدواج وغیرہ کے احکام قرآن نے بنی نوع انسان کو دیے ہیں، جن کے اندر انسان کی تمام فطری مصلحتوں کا نہایت حکیمانہ انداز میں لحاظ رکھ کر انسانیت کو ہمیشہ کے لئے حیوانیت کی دست برد اور نفسانیت کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ کر دیا گیا ہے لیکن جاہلیت جدیدہ ان حکمتوں کو سمجھنے کے لئے کب تیار ہے۔ وہ تو ان تمام قیود کو دور وحشت کی یادگار بتاتی ہے اور انصاف و مساوات کے نام پر عورت کو ترقی کے میدان"

میں لا کھڑا کرتی ہے۔ ایک طرف مرد و عورت کے خلقی فرق کو بھی تسلیم کرتی ہے، دوسری طرف انہیں ایک ہی اسٹیج پر بھی لا کھڑا کر رہی ہے۔ نکاح اور پردے کی قید کو انسانیت کی توہین بتلاتی ہے، اور عورت کے تمام فطری امتیازات کو اٹھا کر، مرد کو قوّامیت سے معزول کر کے، آزادیٔ نسواں کا وعظ کہہ کر، اباحت اور ہوسرانی کا وہ مہیب جہنم زار بنا رہی ہے جس میں آج سارا عالمِ انسانیت جل جل کر خاکستر ہو رہا ہے۔ اور جاہلیت کی سحر آفرینی ملاحظہ ہو کہ عصمت و اخلاق اس کے نزدیک محض بے معنی الفاظ ہیں۔ آج تجدد اور روشن خیالی کی دنیا میں بھائی بہن کے درمیان حرمت کے پردے نہ صرف عملاً بلکہ اعتقاداً بھی اٹھ چکے ہیں۔ آزاد محبت (Free Love) اس کے صنفی تعلقات کا اصل الاصول ہے۔ اس کا اعلان ہے کہ "بیوی سب کی بیوی اور شوہر سب کا شوہر ہے" اور "جس لڑکی پر کسی نوجوان کی نظرِ انتخاب پڑے وہ بلا حیل و حجت اپنے آپ کو اس کے سپرد کر دے"۔ اس کا خیال ہے کہ نفس کی تسکین کا ہر ممکن ذریعہ انسان کے لئے ذریعۂ سعادت ہے۔ ایک روسی مصنف اپنے ایک ناول میں لکھتا ہے:۔

"شراب خوری اور زنا کوئی قابلِ شرم چیزیں نہیں ہیں۔ گناہ کوئی چیز نہیں۔ محبت کرنا، خوب پینا اور عورت کا تعاقب کرنا خاصۂ مردانگی ہے، ایک فطری جذبہ ہے اور فطری جذبہ گناہ نہیں ہو سکتا"۔

لیکن یہ نہ سمجھو کہ جاہلیت کے کمال ارجمندی کا یہ سب سے اعلیٰ شاہکار ہے۔ نہیں، اور آگے چلو۔ اور علم و تمدن کے عین مرکز میں پہنچ کر اس صنفی انارکی اور اخلاق و انسانیت کی تباہی کا اندازہ کرو۔ اسی بیسویں صدی کی تیسری دہائی کا واقعہ ہے کہ جرمنی کا ایک فاضل، ڈاکٹر ہرشفلد (Herschfeld) اس نظریہ کی حمایت کے لئے اٹھا جس پر آج سے چار ہزار برس پہلے حضرت لوط کی قوم عمل پیرا تھی، اور اس نے چند سال کی مسلسل تبلیغ سے رائے عام کو اپنا ہم نوا بنا لیا، یہاں تک کہ جرمن پارلیمنٹ میں کثرتِ آراء سے عملِ قومِ لوط ایک جائز قانونی فعل بن گیا۔ چار ہزار برس کی ترقی سے پرانی جاہلیت اور نئی جاہلیت میں اگر کوئی فرق ہوا

تو وہ صرف اس قدر تھا کہ حضرت لوط کی قوم عام لائسنس کی قائل تھی، مگر جرمن پارلیمنٹ نے اس کام کے لئے یہ شرط لگانی ضروری سمجھی کہ فاعل ومفعول کے درمیان عمر کا تناسب ملحوظ رکھا جائے، اور غیر فطری تعلقات قائم کرنے سے پہلے مفعول کے والدین سے اجازت لے لیجائے!

آج کل دنیا کا سب سے مشکل مسئلہ معاش کا ہے۔ اقوام متمدنہ کی اکثر علمی وفکری صلاحتیں اسی پیٹ کی چاکری میں لگی ہوئی ہیں اور قریب قریب تمام مسائل حاضرہ اسی محور کے ارد گرد گھوم رہے ہیں لیکن انسانی فکر ونظر کی یہ کیسی عبرتناک کوتاہی ہے کہ وہ اپنی پیہم کوششوں کے باوجود اپنے اس تنہا مقصدِ حیات کی گتھی اب تک نہ سلجھا سکی اور آج نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ جس انسان کو خدا کے نام پر اکٹھا ہونے کا حکم دیا گیا تھا وہ روٹی کے نام پر امتیں بنا رہا ہے، معاشی طبقات کے درمیان جنگ کا صور پھونک رہا ہے وَيَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ کی حکیمانہ سنتِ ربانی کو باطل کرنے پر تلا ہوا ہے، اور اس طرح اپنی معاشی ابتری اور اجتماعی بدحالی کی جڑوں کو اپنی نادانی کی وجہ سے اور زیادہ پانی دیئے چلا جاتا ہے اسلام تحریم ربٰوا اور فرضیتِ زکوٰۃ کا اعلیٰ اور عادلانہ نظام پیش کر کے اُن تمام مصائب اور مشکلات رزق کا بہترین حل بتا چکا ہے، جنھوں نے عقل جدید کو حیرانی میں ڈال رکھا ہے۔ مگر یہ عقل جدید! اس کو جاہلیت کی غلامی نے ایسا اندھا بنا دیا ہے کہ اسے بے روزگاری، معاشی کساد بازاری (Economic Depression) ہڑتالیں، ہنگامے، کشت وخون، انقلابی بحران، اشتراکی انقلاب، مزدوروں کی ڈکٹیٹر شپ، سوسائٹی کے نظام کی برہمی، اخلاقی انحطاط، اباحت مطلقہ اور حیوانی بے قیدی، سب کچھ قبول، مگر یہ قاعدۂ کلیہ قبول نہیں کہ سود حیاتِ اجتماعی کے لئے بدترین لعنت ہے اور زکوٰۃ ہی میں انسانی جماعت کے لئے حقیقی فلاح ہے۔ يَمْحَقُ اللهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ کی فطری صداقت جس طرح ۱۳ سو برس پہلے عرب کے جاہل بدو کی سمجھ میں نہ آتی تھی، اسی طرح آج بیسویں صدی میں بھی وہ معاشیات کے ایک ڈاکٹر کی کھوپڑی میں نہیں اترتی۔ یہ بھی اسی چکر میں پھنسا ہوا ہے جس میں عرب کا جاہل سود خوار پھنسا ہوا تھا کہ اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا۔

اس کا دماغ بھی اس وسیع نظریہ کے لئے اپنے اندر کوئی سمائی نہیں رکھتا کہ سود سے انسان کی اجتماعی دولت گھٹتی ہے اور زکوٰۃ سے ترقی کرتی ہے۔

معاش کے بارے میں جاہلیت جدیدہ کو ایک اور نظریہ اپنے اسلاف سے ملا ہے۔ عرب کا وحشی بدو اپنی اولاد کو کمی رزق کے خوف سے قتل کر ڈالتا تھا۔ آج نئی روشنی اور تہذیب کا امام بھی یہی کر رہا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ اس جہالت کو، علم و فلسفہ کے لباس میں لپیٹ کر دنیا کی مسحور نگاہوں کے سامنے پیش کرتا ہے، اور دنیا اس کو بدو کہنے کے بجائے ڈاکٹر کہتی ہے۔ بدو اور ان پڑھ انسان نے یہی جرم کیا تو تہذیب حاضرہ کی زبان لاحول پڑھتے پڑھتے خشک ہوگئی اور اس کی یہ جاہلانہ حرکت "قتل اولاد" کہلائی لیکن جب وہی جاہلانہ تخیل خود اس نے پیش کیا تو تمدن کا ذوق ارتقا اس پر عش عش کرنے لگا اور اس بربریت کا نام "برتھ کنٹرول" رکھدیا گیا۔ یورپ تو یورپ اب ہندوستانی حریت کے ٹھیکیداروں کو بھی آبادی ہند کی روز افزوں کثرت سے فکر دامنگیر ہوگئی ہے اور وہ بھی اپنے استادوں کی پیروی میں خدا کی رزاقیت کا درد اپنے سر میں محسوس کرنے لگے ہیں۔ کس کی ہمت ہے کہ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ کی غریب صدا ان کے کانوں تک پہنچائے؟ اور آخر کس توقع پر؟

تہذیب جدیدہ کے بنیادی اصول کا یہ ایک سرسری خاکہ ہے۔ تم اگر چاہو تو اپنی نگاہ تصور میں اس اجمالی داستانِ حقیقت کو اور پھیلا لو اور بیک نظر اس نظام تہذیب کے ایک ایک خط و خال کو دیکھ لو جو سیف و قلم کی متحدہ حمایت کے زیر سایہ بسیط ارض پر چھایا ہوا ہے۔ کیا تمھیں ـــــ بشرطیکہ تمھاری نگاہ مرعوب نہ ہو ـــــ اس پورے خاکہ میں جاہلیت کے نقوش کے علاوہ کچھ اور نظر آسکتا ہے؟ لیکن ہاں غلطی ہوگی اگر جاہلیت حاضرہ کو کسی قدیم جاہلیت کے ساتھ مشابہت دی جائے، یا اس بیسویں صدی میں اسلام کو صرف اتنا ہی غریب کہا جائے جتنا وہ تاریخ عالم کے کسی پچھلے دور میں تھا۔ آج کا معرکۂ اسلام وجاہلیت صرف یہی نہیں کہ ساڑھے تیرہ سو برس کے قدیم تاریخی صفحات کو دہرا رہا ہے بلکہ "اُس دشمنی"

کے دور میں وہ تمام تاریکیاں جمع ہو گئی ہیں جنھیں نفس کی شیطانی قوت ابتدائے آفرینش سے اب تک پیدا کر سکی ہے۔ آج حق و باطل کے موجودہ تصادم میں باطل کے پیکر پر وہ تمام اسلحہ سجے ہوئے ہیں جنھیں انکی نئی اور پرانی تمام جاہلیتیں مل کر ایجاد کر سکی ہیں۔ فرعون کا افساد فی الارض، قوم ثمود کا علو و استکبار، اہل مدین کا تجارتی و کاروباری مکر و فریب، قوم لوطؑ کا فاحشہ، قوم شعیب کا مذہبی تصور انفرادیت، کفار عرب کا نظریۂ حیات، غرض کونسی جاہلیت ہے جو اس دور میں موجود نہیں اور اسلام کا کونسا پہلو ہے جس کی غرابت میں شک کیا جائے۔

دوسروں کے نقطۂ نظر کا جائزہ تو لے چکے۔ آئیے ذرا اب اپنے جیب و دامن کو بھی ٹٹولیں کیونکہ یہ تلخ داستان نامکمل رہے گی اگر اس کے اُس سب سے زیادہ دردناک پہلو کا ذکر نہ کیا جائے جو ہم اسلام کے نام لیواؤں کی بدولت نمایاں ہو رہا ہے۔ یقیناً یہ حقیقت نہایت ہی جانگداز ہے لیکن ہے حقیقت اور حقیقت کا وجود ہمارے آپکے انکار سے معدوم نہیں ہو سکتا۔ اغیار کی مادہ پرست اور جہل آشنا نگاہیں اگر اسلام کے روحانی حسن اور عقلی جمال کو نہیں دیکھ پاتیں تو اس کا گلہ ہی کیا کہ وہ تو ہیں ہی کور ذوق اور نامحرم ہاں ماتم اگر ہے تو اپنوں اور بیگانوں کا۔ ہمیں غیر مسلموں کو یہ طعنہ دینے کا کیا حق کہ اسلام جیسا عقلی و فطری مذہب ان کی نظروں میں "غریب" دکھائی دے رہا ہے، جبکہ خود پیروان اسلام کے اقوال و افعال سے اس کی غرابت کا دن رات ثبوت بہم پہنچ رہا ہو۔ اور یہ لازمی نتیجہ ہے مسلمانوں کے اس سیاسی اختلال اور فکری جمود کا جس کی طرف ہم کہیں اوپر اشارہ کر چکے ہیں۔ دنیا کی زمام قیادت جب قرآنی تہذیب کے ہاتھوں سے نکل کر جاہلیت اور مادیت کے ہاتھوں میں چلی گئی تو فطرۃً مسلمانوں کی فعال ذہنیت اشکوہ جاہلیت سے مرعوب و متاثر ہونے لگی، اور اس مریض جسم کی طرح جو اپنی قوت کھو کر ہر بیماری کو قبول کرنے کے لئے تیار رہتا ہے، پیکر اسلامی جاہلی امراض کا آماجگاہ بن گیا۔ اس کے منفعل قوی جاہلی اوہام اور غیر اسلامی افکار و تصورات کے سانچے میں ڈھلنے لگے خواہ ان کا تعلق قدیم جاہلیتِ عرب و ہند سے

ہو یا جدید جاہلیت روم و فرنگ سے۔

توحید و معاد کے نظریات کا وجود کیا مشرکین عرب میں نہ تھا؟ یا دیگر اقوام ضالہ اس اعتقاد سے خالی تھیں؟ لیکن پھر بھی قرآن نے انہیں خدا اور یوم آخر کا منکر کیوں کہا؟ بات صرف اتنی ہی تو تھی کہ ان کا اقرار انکار کے ہم معنی تھا۔ وہ زمین و آسمان کا خالق اور حاکم علی الاطلاق تو خدا ہی کو مانتے تھے لیکن نگاہ میں پستی اور تنگی تھی، اس لئے اس کی قدرت، عظمت اور کبریائی کا معیار دنیوی سلاطین کے اقتدار کو ٹھیراتے تھے۔ وہ دیکھتے کہ دنیا کے عام بادشاہوں کے دربار میں تقرب حاصل کرنے کا واحد ذریعہ امرائے دربار اور اعیان حکومت کی رضا جوئی ہوا کرتا ہے اور مراحم خسروی کا طالب پہلا سجدہ انہیں درباریوں کو کرتا ہے۔ اس پر قیاس کر کے ان تنگ نظر جاہلوں نے تصور الوہیت کو بھی بشریت کا نقاب اڑھا دیا اور ہر پیر اور ولی کو اس کا درباری مان کر پوجنا شروع کر دیا کہ خدا کے دربار میں یہ ہماری شفاعت کریں گے۔ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِیُقَرِّبُوْنَا اِلَی اللّٰہِ زُلْفٰی ان کے مشرکانہ تخیل کا سنگ بنیاد تھا۔ ظاہر ہے کہ اس تخیل کے ماتحت توحید اور قیامت کے عقائد بلحاظ نتائج بالکل بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ایسے جاہلانہ تخیلات مختلف بھیسوں میں انسانی دماغوں پر چھائے ہوئے تھے۔ کوئی اوتار اور حلول کے وہم میں گرفتار تھا۔ کوئی (معاذ اللہ) خدا کی بیوی بچوں کی پناہ ڈھونڈھ رہا تھا۔ کوئی اس کے بیٹے کے خون سے اپنے اعمال کی سیاہی دھو کر بے فکر بیٹھا تھا۔ کوئی نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰہِ وَاَحِبَّآؤُہٗ کے خواب گراں میں مست انگڑائیاں لے رہا تھا۔ جاہلیت کی ایک روح نہ معلوم کتنے قالبوں میں چھپی ہوئی زمین کے دامن پر اپنے قدم جمائے بیٹھی تھی کہ قرآن کی صدائے غریب نے ان سب خیالات کی تکفیر و تضلیل کر کے الوہیت اور قیامت کا وہ عقلی اور ٹھیٹھ فطری نظریہ پیش کیا جس کی تفصیل قرآن کے صفحوں میں اب بھی اسی طرح محفوظ ہے جس طرح عہد رسالت میں تھی۔ مگر بتائیے تو سہی آج اہل قرآن کے ذہنوں میں بھی ان بلند حقائق کا وہی نقشہ موجود ہے جو خیر القرون میں تھا؟ پتھر کے مجسموں کا پجاری گمراہ تھا، جاہل تھا، کج فطرت اور طاغوت پرست

تھا، مگر یہ مزاروں پر پیشانیاں رگڑنے والا، یہ اہل قبور سے حاجتیں مانگنے والا اور یہ "یا حضرت فلاں" کی جے لگانے والا مسلمان کتنا راست کیش، کتنا سلیم الفطرت اور کتنا وسیع الدماغ ہے؟ عرب کا جاہل شفاعت اور تقرب کی خاطر غیر اللہ کو پوج کر اگر بندۂ جاہلیت کہلایا تو نہیں تاویلوں کے ساتھ رسول پرست، ولی پرست، امام پرست، اور پیر پرست مدعیانِ اسلام کو کس کا بندہ کہا جائے؟۔

انبیاء کے متعلق جاہلیت کا مشتقل نظریہ یہ رہا ہے کہ بشر خدا کا رسول نہیں ہو سکتا۔ اور اس جاہلی نظریے نے خدا کے ہر نبی پر دو طریقوں سے حملہ کیا ہے۔ جب کوئی نبی مبعوث ہوا تو اس پر پہلا حملہ اس شکل میں کیا گیا کہ "تم بشر ہو، اور بشر خدا کا رسول نہیں ہو سکتا، اس لئے تم رسول نہیں ہو" پھر جب نبی اپنے کارناموں کی دھاک بٹھا کر دنیا سے رخصت ہو گیا تو جاہلیت نے پیترا بدل کر دوسرا حملہ اس طرح کیا کہ "وہ چونکہ رسول تھا اور بشر خدا کا رسول نہیں ہو سکتا، لہذا وہ بشر نہ تھا" یہود نے اسی طریقہ سے حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بنایا اور نصاریٰ نے اسی ہتھیار سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر حملہ کرکے انہیں ابن اللہ بلکہ اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الْمَسِیْحُ کے مقام تک پہنچا دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی جاہلیت کا پہلا اعتراض یہی تھا کہ بشر خدا کا رسول کیونکر ہو سکتا ہے؟ اس اعتراض کے جواب میں خداوند عالم نے بار بار باصرار فرمایا کہ رسول جب ہوگا بشر ہی ہوگا۔ لیکن آج ہمارے علم و معرفت کے میناروں سے صدا بلند ہوتی ہے کہ ہاں بشر خدا کا رسول تو ہو سکتا ہے مگر خدا کا آخری رسول بشر نہیں تھا اور آنحضرت صلعم کو جو بشر کہے وہ مسلمان نہیں۔ اس صدا پر قرآن کی روح مضطرب ہو تو ہوا کرے مگر جاہلیت کی روح اپنی دیرینہ تمنا سے ہم آغوش تو ہو گئی۔

قرآن نے جب ہمیں منکرینِ اسلام کا یہ عجیب نظریہ بتایا کہ ہدایت کا معیار صرف دنیوی وجاہت اور تمکن فی الارض ہے تو ہم متحیر تھے کہ انسان اتنا پست نظر اور نادان بھی ہوتا ہے! مگر قدرت نے اعجازِ بادِ بیت کی یہ تصویر آج واقعیت کے پردے پر دکھلا دی، چنانچہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہمارا ایک حکیم امت علی الاعلان اسی نظریہ کو پیش کر رہا ہے۔ اس کے نزدیک ملحد فرنگی اللہ کا خلیفہ اور اس کا محبوب ہے، ہدایت یافتہ اور

حق پرست ہے، محض اس وجہ سے کہ اس کے پاس مال و زر ہے، تاج و تخت ہے، دنیوی اقتدار اور مادّی قوت ہے، اور اسے تمکن فی الارض حاصل ہے لیکن مسلمان بے دین ہے، باطل پرست ہے، ہدایت ناآشنا ہے، خدا کا مغضوب اور نافرمان ہے، کیونکہ وہ مفلس ہے، قلاش ہے، غلام ہے، محکوم ہے، کمزور اور ضعیف ہے کوئی شخص اگرچہ کتنا ہی پاک طینت اور متقی سہی مگر برسرِ ہدایت ہونے کے لئے سند میں جو چیز پیش کی جا سکتی ہے وہ طور کی روشنی اور فاران کی تجلی نہیں ہے بلکہ فرعون کا تاج و تخت اور ابولہب کا مال و زر ہے۔ یہ حکیم وقت جب بے نوا مسلمانوں کو دیکھتا ہے تو آقائے فرنگ کی زبان سے وہی کہتا ہے جو عرب کے جاہلوں نے ۱۳۵۰ برس پیشتر کہا تھا کہ اَهٰۤؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ؕ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ ؟

اسی طرح جاہلیت اولی کی جن مردہ سنتوں کو مسلمانوں نے زندہ کر کے اپنے نظامِ مذہب میں داخل کر لیا ہے ان میں سے ایک سنت ظاہر پرستی اور آبا پرستی کی ہے جس سے قدرتاً فرقہ پرستی پیدا ہوئی۔ قدیم جاہلیت میں قرآن کی ہر سچائی اس لئے ناقابلِ قبول تھی کہ اہل عرب کے آباؤ اجداد سے وہ منقول نہ تھی۔ جو لایعنی رسوم باپ دادا کی وراثت میں ملی تھیں وہی اصل دین سمجھی جاتی تھیں۔ ہر ایک اپنی رسموں کو دانت سے پکڑے ہوئے تھا، انھیں کو سچائی اور ہدایت سمجھے بیٹھا تھا، اپنے کو سچا اور تمام دوسرے گروہوں کو گمراہ یقین کرتا تھا۔ وَكُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ٥ میں ان کی اسی جہالت کی طرف اشارہ ہے۔ ان کے ہاں اصل چیز مظاہر تھے، معانی سے انھیں کوئی بحث نہ تھی۔ مظاہر کی کسی تبدیلی کو دین کی موت خیال کرتے۔ تحویل قبلہ کے وقت اس جاہلانہ ذہنیت نے جو ہنگامہ بپا کیا اس سے کون ناواقف ہے؟۔ آج کی جاہلیت میں وہی ٹریجڈی پھر دہرائی جا رہی ہے۔ اسلام کے پیرو اسی رسم پرستی اور فرقہ پروری پر جھتے بنا رہے ہیں۔ وحدت اسلامی اسی آبا پرستی پر قربان کی جا رہی ہے۔ اکابر کے اقوال و افعال معیارِ صداقت قرار پا رہے ہیں۔ دین کی رگ جاں پر چھری چل جائے

تو کچھ نہیں بگڑتا مگر مظاہر کی ادنیٰ سی تبدیلی میں اسلام کی ہلاکت اور ایمان کا زیاں تبلایا جا رہا ہے۔ ہر نئی یا غیر چیز جو کتاب آبا میں موجود نہیں، باطل اور ضلالت ٹھیرائی جارہی ہے۔ نیکی اور تقویٰ کو کوئی نہیں پوچھتا مگر ظواہر کی حفاظت میں۔۔۔ خواہ وہ نماز میں ہاتھ اٹھانے اور نہ اٹھانے ہی تک کیوں نہ محدود ہو۔ خونِ مسلم تک کی حرمت پامال کردی جاتی ہے۔ کوئی ایک جماعت نہیں جو اس جہل میں مبتلا ہو۔ پوری امت اسی کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ کی لعنت اوڑھے ہوئے ہے۔ اور کوئی نہیں جو خدا کے بندوں کا ماتھا جاہلیت کے آستانہ سے اٹھادے۔

مذہب کی وہ حقیقت بھی جو مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونَ کے ذریعہ بتلائی گئی تھی اسی تنگ نظری اور جاہلی تصور مذہب سے دوچار ہے جس نے ابتدائے اسلام میں اس سے ٹکر لی تھی۔ اسلام نے جب مذہب کو رسوم کے شکنجے اور معبد کے گھیرے سے نکال کر سیاست، حکومت، معاشرت معیشت، خانگی تعلقات، انفرادی اعمال اور اجتماعی افکار و معاملات تک پھیلا دیا تو انسان اس وسعت وہمہ گیری کے خلاف بغاوت کر بیٹھا، کیونکہ اس طرح اباحت نفسانی کے تمام دروازے بند ہوئے جارہے تھے۔ بعینہٖ یہی نفسیاتی رکاوٹ آج ہم مسلمانوں کو درپیش ہے۔ اِس وقت جاہلیت نے زندگی کا جو میدان دنیا کے سامنے تیار کر رکھا ہے اس میں دوسروں سے بازی لے جانے میں اسلام کا یہی نظریۂ مذہب سخت رکاوٹ پیدا کر رہا ہے، لہٰذا مسلمانوں نے نہ صرف تجدد کے بالاخانوں پر بلکہ خانقاہ کے تاریک حجروں میں بھی مذہب کا مثلہ کرنا شروع کر دیا۔ عرصۂ حیات کے ایک ایک گوشہ سے مذہب کے دامن کو سمیٹا جارہا ہے اور بوالعجبی دیکھئے کہ اسلام کی عالمگیری کے ادعا ہی سے اس کی عالمگیری کی نفی کی جارہی ہے۔ اس فریب یا خود فریبی کو چھپانے کے لئے کہیں "عالمگیر صداقت" کا خوشنما نقاب تیار کیا گیا ہے اور ارشاد ہوتا ہے کہ "اسلام چند عالمگیر سچائیوں کا نام ہے۔ اسے مٹنے کا کوئی خطرہ نہیں، وہ ہر قالب میں زندہ رہ سکتا ہے"۔ اور کسی طرف سے یہ حکیمانہ آواز آتی ہے کہ مذہب کو دنیوی معاملات

کے ہر شعبے پر حاوی کرنا اس کے عالمگیر ہونے کا انکار کرنا ہے"۔ مغرب زدہ مسلمان ابھی صرف اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ "سیاست اور معاشرت وغیرہ کو مذہب سے کیا تعلق"، کہ معارف پرور ائمۂ دین نے اعلان کر دیا کہ "نہ صرف یہی بلکہ ایمان بالرسالت بھی چنداں ضروری نہیں"۔ پھر اسی کوتہ نظری نے ہم ہی مسلمانوں سے یہ کہلا کر کہ اسلام کا کوئی مخصوص تہذیب و تمدن نہیں، حدیث کا انکار کرایا، تاکہ قرآن کے اصول کو جس طرح چاہیں توڑ مروڑ کر جاہلیت کے قالب میں ڈھال لیں، اور جب نوجوان مسلمان اشتراکیت کے فریب میں آکر کارل مارکس کا کلمہ پڑھنے لگیں تو یہ کہنے میں باک نہ ہو کہ "خدا کا شکر ہے کہ مسلمانوں کا مستقبل روشن ہے کیونکہ مسلم نوجوان اشتراکیت کی طرف آرہے ہیں"۔

یہ اور اسی قسم کی صدہا آوازیں اسلام کے نام سے بلند ہو رہی ہیں، اسی اسلام کے نام سے جو ایک جزوی مسئلہ قصاص بیان کر کے کہتا ہے کہ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ ۔ ہاتھ کے بدلے ہاتھ کاٹنے کا حکم نہ ماننا اسلام کی نگاہ میں فسق ہے مگر اسلام کے ہر عضو کی قطع و برید پر ایک نئی خوشی محسوس کرنا اہل اسلام کے نزدیک سب سے بڑی ملی خیر خواہی ہے!۔

اس غیر اسلامی تصور مذہب کے مہلک جراثیم نے ہماری خانقاہوں میں ایک ادنیٰ سی مگر اسی نوعیت کا مرض پیدا کر رکھا ہے۔ وہاں سارا دین نماز روزے اور ذکر و مراقبہ تک محدود ہے۔ روحانیت کے ان آئینہ خانوں میں جدھر دیکھئے چند مخصوص عبادتوں کی تصویریں نظر آئیں گی۔ کسی سیاسی، معاشی، معاشرتی یا تمدنی معاملہ کا ذکر ہوا کہ للّٰہیت کی پیشانی شکن آلود ہوئی۔ ان کے نزدیک یہ سب دنیا داری کی باتیں ہیں۔ دین داری یہ ہے کہ دنیا اور اس کے معاملات کو کفار و منافقین کے ہاتھ میں چھوڑ دیا جائے اور سچا دانا مسلمان ایک گوشے میں بیٹھا ہوا بس تسبیح و تہلیل اور ذکر و شغل کرتا رہے۔ اس کے حجرے سے باہر ساری دنیا پر طاغوت کی حکومت قائم ہو جائے تو کچھ حرج نہیں۔ خدا کی شریعت کے بجائے شیطانی قوانین پر انسانی تمدن کی بنا رکھ دی جائے، حرام حلال ہو اور حلال حرام ہو کر رہ جائے، اخلاق کے معیار الٹ جائیں او

عدل و تقویٰ ایک لفظِ بے معنی بن جائے، ہمارے اس دین دار بزرگ کو اس سے کچھ بحث نہیں۔ وہ تو اللہ والا ہے۔ اُس کو اِن جھگڑوں سے کیا سروکار؟ اس کا کام تو اللہ کی عبادت کرنا ہے، اور اللہ کی عبادت یہ ہے کہ اوراد و وظائف اور نوافل اور مراقبہ اور حلقۂ ذکر میں زیادہ سے زیادہ وقت صرف کیا جائے ــــ دین داری کے اس راہبانہ تصور نے اسلام کی روح کو مسخ کر کے رکھ دیا ہے۔

ذکر، عبادت، صبر، توکل، تقویٰ، عمل، مجاہدہ، غرض تمام اسلامی الفاظ کے معنی الٹ گئے ہیں۔ اب خالص بے عملی کا نام "عمل" ہے، اور عمل اب کرنے کی چیز نہیں بلکہ پڑھنے کی چیز بن کر رہ گیا ہے۔ ذکر کے معنی اب یہ ہیں کہ تسبیح چلے، ہونٹ ہلیں اور رات دن میں ہزاروں لاکھوں مرتبہ اللہ کا نام زبان پر جاری ہو۔ باقی رہا وہ ذکر جس کی طرف فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَ ابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ[1] میں اشارہ کیا گیا ہے، تو اس کا تصور تک دماغوں سے نکل چکا ہے، اور اسے اب عین دنیا داری سمجھا جاتا ہے۔ عبادت کے معنی اب چند مخصوص اعمال کے ہیں، اور ان اعمال کی بھی روح کے نہیں بلکہ محض ظاہری شکل کے۔ اگر کوئی شخص صرف فرائض ادا کرتا ہو اور اس کے بعد اپنا سارا وقت کفر و جاہلیت کی طاقتوں کے خلاف جنگ کرنے اور اسلام کی سربلندی کے لئے کوشش کرنے میں صرف کر دے تو وہ عبادت گذار نہیں بلکہ دنیا دار ہے، کیونکہ وہ مسجد کے

[1] یہ آیت سورۂ جمعہ میں آئی ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ "جب نماز ختم ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اپنے کاروبار میں اللہ کا فضل (رزقِ حلال) تلاش کرو اور اللہ کو بکثرت یاد کرتے رہو"۔ یہاں اللہ کو یاد کرنے کا مطلب صاف طور پر یہ ہے کہ دنیوی کاروبار کے ہنگامے میں اللہ کے حدود اور شریعتِ الٰہی کے احکام کا خیال رکھو۔ جہاں قدم قدم پر شیطانی وسوسے اور خواہشاتِ نفس کے خدشے سامنے آتے ہیں، جہاں جھوٹ، اور خیانت اور حرام خوری اور بدنظری کے بے شمار مواقع پیش آتے ہیں اور شیطان ان کے اندر فائدے کی صورتیں دکھاتا ہے، وہاں تمہیں یاد رہے کہ خدا تم کو دیکھ رہا ہے اور ایک دن تمہیں اس کی عدالت میں حاضر ہونا ہے۔ ہر مرتبہ جب حرام اپنی ظاہری منفعتوں اور لذتوں کے ساتھ اور حلال اپنے ظاہری نقصانات اور تکلیفوں کے ساتھ دوش بدوش تمہارے سامنے آئیں تو خدا کا خوف تمہیں حرام کو چھوڑنے اور حلال کو اختیار کرنے پر آمادہ کرے۔ یہ ہے اصل یادِ الٰہی، اور اس میں مجاہدہ، صبر، توکل، تقویٰ، سب شامل ہیں۔

بجائے دفتر میں بیٹھا ہوتا ہے، رکوع و سجود کے بجائے قلم و کاغذ کے کام میں مشغول نظر آتا ہے، اور عبادت کی ان صورتوں سے ہمارے دین دار لوگ قطعی ناآشنا ہیں۔ ان کے نزدیک عبادت صرف وہ شخص کرتا ہے جو فرائض کے ساتھ تہجد اور اشراق اور چاشت کی نمازیں بھی پڑھے، تسبیح کے دانوں کو بھی گردش دے اور الّا اللہ کی ضربیں بھی لگائے۔

تصورات کا انقلاب بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ جو سیدھا سادہ مسلمان فرائض ادا کرنے کے بعد رزق حلال کمانے اور اپنے حق داروں کے حقوق ادا کرنے میں لگا رہتا ہے وہ تو دنیا کا کتا ہے، اور جو بزرگ اللہ والے بن کر خانقاہ میں شب و روز مشغول عبادت رہتے ہیں اور لگی بندھی فیس لے کر لوگوں کیلئے دعائیں کرتے ہیں، یا تعویذ گنڈوں کی قیمت وصول کرتے ہیں، یا وعظ کہنے کے لئے آمد و رفت کا کرایہ اور نذرانہ طلب فرماتے ہیں وہ کمال درجہ کے دین دار ہیں!۔

خانقاہوں سے گذر کر مدرسوں کی طرف آئیے تو یہاں جاہلیت کی کارفرمائی ایک دوسرے ہی رنگ میں نظر آتی ہے۔ یہاں ظاہر پرستی اپنی انتہا کو پہنچ گئی ہے۔ اسلام ان کے نزدیک ایک محسوس اور مرئی چیز ہے جس کو ناپا اور تولا جا سکتا ہے۔ انھوں نے مسلمان کا ایک پیمانہ بنا رکھا ہے۔ جہاں کوئی شخص سامنے آیا اور انھوں نے فوراً اپنا پیمانہ اس پر رکھ کر ناپ لیا۔ اگر وہ پیمائش میں پورا اترا تو اسے تشرع اور دین داری کا سرٹیفکیٹ دے دیا گیا۔ پھر چاہے وہ اپنے اعمال اور اخلاق میں خفیہ اور علانیہ قانونِ الٰہی کی کتنی ہی خلاف ورزیاں کرتا رہے، مگر "دینداری" بہرحال اس کے ساتھ چپکی رہے گی۔ اس کا شمار متشرع لوگوں ہی میں ہوگا، اور وہ اپنی ظاہری ہیئت سے عام مسلمانوں کو اور شائد خود اپنے نفس کو بھی عمر بھر دھوکا دیتا رہے گا۔ برعکس اس کے اگر کوئی شخص اس مقررہ پیمانہ سے ایک انچ کا سولہواں حصہ بھی کم نکلے تو بلا تامل اس کو فاسق، فاجر، بد دین قرار دے دیا جائے گا۔ پھر اس کی نماز، اس کا روزہ، اس کی پرہیزگاری، اس کی اخلاقی طہارت، سب ان کے نزدیک بے معنی ہیں، حتیٰ کہ اگر وہ فاسق کسی اجر و معاوضہ کے بغیر اللہ کے دین کی خدمت کرے، اور راہِ خدا میں اپنے نفس اور مال کی قربانی

دے تب بھی مذہب کے یہ اجارہ دار اس کی تمام خدمات پر پانی پھیر دیں گے، محض اس لئے کہ چند جزئیات میں اس کا عمل ناقص ہے، اور ان کے مذہب میں اصل دین بس یہی جزئیات ہیں ــــ اگر ابو محجن ثقفی ان حضرات کے دور میں ہوتے تو یقیناً یہ شراب خوری کے جرم میں ان کی پیٹھ کے ٹکڑے ہی اڑا دیتے، اور حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کو، جنھوں نے میدانِ جہاد میں ابو محجن کی جانفشانی دیکھ کر حد شرعی معاف کر دی تھی، نہ معلوم کیسے تند و تیز الفاظ میں مطعون کرتے!۔

اصل یہ ہے کہ انھوں نے حقائق اور معانی کو بالکل فراموش کر دیا ہے اور صرف اعمال کی ظاہری صورتوں ہی کو یہ دین سمجھتے ہیں۔ اس غلط تصور کا نتیجہ یہ ہے کہ احبار یہود نے جس طرح ظاہر پرستی میں شریعتِ الٰہی کی روح اور اس کے مقاصد کو گم کر دیا تھا، اسی طرح یہ حضرات بھی اس کو گم کر بیٹھے ہیں۔ ظاہری شکلوں کے الٹ پھیر سے حرام کو حلال اور ناجائز کو جائز کر دینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے، اور یہ سمجھتے ہیں کہ خدا کے نزدیک بھی ان تغیرات سے حقیقت بدل جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ان کے عقیدہ میں زکوٰۃ کے لئے تملیک شرط ہے اور مدرسے کے فنڈ میں زکوٰۃ داخل نہیں ہو سکتی۔ لیکن اگر کوئی شخص ان کے پاس زکوٰۃ لائے تو یہ اس کو چھوڑیں گے نہیں بلکہ ایک غریب طالب علم کو بلائیں گے اور اس سے کہیں گے کہ تو ایک ہاتھ سے زکوٰۃ لے اور دوسرے ہاتھ سے مدرسے کو ہبہ کر دے۔ اس طرح جو چیز ناجائز ہے وہ محض ہاتھ بدلنے سے جائز ہو جاتی ہے۔ ان کے نزدیک یہ بھی بالکل جائز ہے کہ ایک شخص کو روپیہ دے کر اس بات پر تیار کیا جائے کہ وہ مطلقہ عورت سے نکاح کر کے اسے طلاق دیدے اور اس تدبیر سے وہ شوہر اول کے لئے حلال ہو جائے۔ جو لوگ اپنی بیویوں کو طلاق دے کر پشیمان ہوتے ہیں اور انہیں دوبارہ اپنے نکاح میں لانا چاہتے ہیں انہیں حلالہ کرنے کی یہ تدبیر علانیہ ہمارے دار الافتاؤں میں سکھائی جاتی ہے اور کوئی نہیں سوچتا کہ اس سے قرآن کا اصل مقصد ہی فوت ہوا جاتا ہے۔ وہاں تو تحلیل کی شرط لگائی ہی اس لئے گئی تھی کہ اس کڑی شرط کی وجہ سے لوگ طلاق دیتے ہوئے ڈریں مگر اس حیلہ نے مالدار اور با اثر لوگوں کے لئے اس چیز کو

آسان بنا دیا جسے اللہ نے مشکل بنانا چاہتا تھا۔ ختم سال سے پہلے روپے کو بیوی کے نام ہبہ کرنا اور پھر ختم سال سے پہلے اپنے نام ہبہ کرا لینا اور اس طرح فریضۂ زکوٰۃ سے بچ جانا، یہ بھی ایک معروف حیلہ ہے جس کو اچھے خاصے متشرع حضرات خود استعمال فرماتے ہیں اور دوسروں کو سکھاتے ہیں۔ ان حرکات پر دراصل حضرت ایوب کے تحنث کی نہیں بلکہ اصحاب السبت کی مثال راست آتی ہے جن کی دینداری کو آزمانے کے لئے اللہ نے ہفتہ کے روز مچھلیاں پکڑنا حرام کیا تھا تو انھوں نے یہ تدبیر نکالی کہ جمعہ کے روز جال پھینک کر چھوڑ دیتے، اور اتوار کے روز جا کر مچھلیاں پکڑ لیتے، تاکہ ان کی خواہشِ نفس بھی پوری ہو جائے، اور فرمانبرداری کی ظاہری شکل بھی بنی رہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان تدبیروں سے اللہ تعالیٰ بھی دھوکا کھا جائے گا، مگر اللہ نے اس بدترین فسق کو طاعت اور تقویٰ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ ۝۔

جاہلیت ہی کا ایک کرشمہ یہ بھی ہے کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کو چھوڑ کر اپنے رجحانِ نفس اور میلانِ طبع کو دین و شرع کا پیمانہ بنا لیا گیا ہے۔ مآخذ علم میں شارع نے یہ ترتیب رکھی تھی کہ پہلے کتاب اللہ، پھر سنت رسول اللہ، پھر راسخین فی العلم کے اجتہادات۔ لیکن یہاں اس ترتیب کو انٹ کر یوں کر دیا گیا کہ پہلے اُن ائمہ کے اجتہادات جن سے ہم کو عقیدت ہے۔ پھر سنت رسول اللہ جس کا علم صرف اس لئے حاصل کیا جاتا ہے کہ اپنے پسندیدہ مذہب کی تائید میں دلائل فراہم ہوں۔ سب سے آخر میں کتاب اللہ جس کو پڑھنے کا مقصد علم دین کی تحقیق نہیں بلکہ محض حصولِ ثواب ہے یا پھر کلام الٰہی کی بلاغت اور اس کے محاسنِ لفظی سے لطف اندوز ہونا۔ اسی طرح عقائد میں شارع نے یہ ترتیب رکھی تھی کہ سب سے اول ایمانیات، پھر وہ اعتقادی جزئیات جن میں تعبیر و تاویل کے اختلاف کو خود صاحبِ شریعت علیہ السلام اور صحابہ اور ائمہ نے جائز رکھا ہے۔ مگر اس ترتیب کو الٹ کر ہر گروہ نے اپنے اہواء کے مطابق یوں کر دیا کہ سب سے پہلے وہ جزئی عقیدہ جس سے ایک فرقہ کو خاص دلچسپی ہے۔ پھر ایمانیات جن پر اعتقاد رکھنے کے باوجود ایک شخص صرف

اس لئے کافر، ملحد، زندیق، فاسق اور گمراہ ہو سکتا ہے کہ وہ اس خاص جزئی عقیدہ میں ان سے متفق نہیں۔ اسی طرح اوامر میں شارع نے یہ ترتیب رکھی تھی کہ سب سے اول فرائض، پھر سنن مؤکدہ پھر مستحبات و مستحسنات علیٰ اختلاف مدارجہا۔ اس ترتیب کو بھی ہر گروہ نے اپنی دلچسپیوں کے لحاظ سے الٹ کر رکھ دیا۔ اب وہ اوامر جو استحسان و استحباب کے درجہ میں ہیں، سب سے بڑھ کر اہمیت رکھتے ہیں، ان کے بعد موکّدات کا درجہ آتا ہے، اور آخر میں فرائض ہیں۔ یہی صورتِ معاملہ منہیات کے باب میں بھی پیش آئی ہے۔ شارع نے سب سے بڑھ کر محرّمات اور کبائر کی ممانعت پر زور دیا ہے۔ اس کے بعد صغائر کا مرتبہ آتا ہے اور آخر میں وہ منکرات و مکروہات ہیں جن کی ممانعت بتصریح نہیں کی گئی ہے بلکہ تخریج و استنباط کے طور پر اشارۃ النص یا دلالۃ النص سے نکالی گئی ہے۔ مگر ہر جماعت نے اپنے رجحانِ طبع کے زیرِ اثر اس ترتیب کو بھی الٹ دیا۔ اب تیسرے درجہ کے مکروہات پر سب سے زیادہ زور دیا جاتا ہے، اس کے بعد صغائر کا مرتبہ آتا ہے اور آخر میں محرّمات اور کبائر ہیں جن کا ذکر زبانوں پر کم ہی آتا ہے —— یہ سب سے بڑی اور سب سے بدتر بدعت ہے جس کو ام البدعات کہنا چاہئے! وہ یہ تمام بدعات سے بڑھ کر خطرناک ہے، کیونکہ اس کو علمِ دین اور تشرّع اور للّٰہیت کا لباس پہنا دیا گیا ہے، حالانکہ اس کی بنا دراصل اس نہایت گہری ہوا پرستی پر قائم ہے جو نفس کے چور خانوں میں چھپی ہوئی ہے۔ اس فتنۂ عظیم کی شاخیں بے شمار، اور اس کے نتائج بے حد و حساب ہیں۔ علمِ دین میں جمود، قابلیتِ اجتہاد کا فقدان، فرقہ بندی میں غلو، تکفیر و تفسیق کی گرم بازاری، مہمات سے بے پروائی اور لاطائل فضولیات میں انہماک، کرنے کے کاموں کو چھوڑ دینا اور لایعنی باتوں میں اپنی ساری قوتوں کو ضائع کر دینا، یہ سب اسی ایک فتنہ کے نتائج ہیں۔ حاملانِ دینِ متین مطمئن ہیں کہ اَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا۔ اور شیطان بغلیں بجا رہا ہے کہ جو قوم قرآن جیسی خطرناک کتاب رکھتی تھی، جس سے خوف تھا کہ جاہلیت کا تختہ الٹ کر رکھ دے گی، اس کو وہ اس ذوقِ فضول میں لگا دینے میں کامیاب ہو گیا۔

ایک طرف سے جاہلیت اولیٰ مسلمانوں کی ذہنیتوں پر یوں بار بار حملے کر کے انہیں اسلامی تصورات سے بیگانہ بنا گئی، اور دوسری طرف سے جاہلیتِ فرنگ نے اپنے جدید ہتھیاروں سے قرآنی تہذیب کی رہی سہی یادگاروں پر بھی یلغار کر دی۔ قدیم جاہلیت کی فتحمندیوں نے اندر سے دین کے نظام کو مسخ کیا اور جدید جاہلیت نے اجتماعی خیالات اور سیاسی، معاشرتی، اور معاشی نظریات کو الٹ کر رکھ دیا، حتیٰ کہ آج ہم بحسرت دیکھ رہے ہیں کہ اللہ کی اس پھیلی ہوئی زمین پر ایک گوشہ بھی ایسا موجود نہیں جہاں اسلامی نظام زندگی اپنی کامل صورت اور بے آمیز ہیئت اجتماعی کے ساتھ نافذ ہو۔ اگر کہیں اس نظام کا کوئی دھندلا سا خاکہ ہے بھی تو تہذیب حاضر کے موجودہ سیلاب کے سامنے اس کی حیثیت بالکل وہی ہے جو کسی پر شور سمندر کی طوفانی لہروں میں ایک کشتی کے ٹوٹے ہوئے تختوں کی ہوتی ہے اور یہ نتیجہ ہے اپنی اس وقت کی خود فراموشی کا جب ہم نے یورپ کو ایک ہاتھ سے قلم اور دوسرے سے تلوار بخشتے ہوئے کہا تھا کہ تو

تیغ ہے یہ طشت ہے یہ ہم ہیں کشتنی

لہٰذا اب سعادت تو اسی میں ہے کہ مادی تہذیب کا نشتر جب اسلامی نظام کی ایک رگ کاٹ لے تو دوسری اس کے سامنے کر دی جائے، اور الحمد للہ کہ ہم اس فریضۂ سعادت کو بڑی تندہی اور خوش اسلوبی سے سرانجام دے رہے ہیں۔ مغرب سے آواز آئی کہ ۱۳۵۰ برس کا پرانا مذہب خواہ کیسا ہی کامل اور وسیع کیوں نہ ہو، موجودہ دور تمدن میں کام نہیں دے سکتا۔ ہم نے کہا اٰمَنَّا وَصَدَّقْنَا۔ ایک مادہ پرستانہ نظام غربا پروری کا جامہ پہن کر روس سے چلا تو ہم نے یہ کہتے ہوئے بڑھ کر اس کا خیر مقدم کیا کہ اسلامی مواساۃ تو اسی اشتراکیت کا نام ہے۔ مغرب نے اپنا معاشی نظام بینکنگ اور انشورنس پر قائم کیا تو ہمارا مفتی بول اٹھا کہ ہندوستان دار الحرب ہے، یہاں سود لینا (جس کی شان میں فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ کی تہدید نازل ہوئی تھی) جائز ہے، مستحسن ہے، بلکہ سراپا رحمت ہے، وَمَنْ يُّقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا الآیۃ کا شان نزول یہی سودی کاروبار ہی تو ہے۔

تمدن اور معاشرت نے نئے نئے فیشن ایجاد کیئے تو ہمارے "تعلیم یافتہ" حضرات نے اسلامی وضع قطع پر قدامت پرستی کے فتوے لگائے اور اسے دیکھ کر وَاِذَا مَرُّوْا بِہِمْ یَتَغَامَزُوْنَ کی یاد تازہ کی۔ اباحتِ نفس کے اشارے پر مغرب نے پردہ کو خلافِ انسانیت ٹھیرایا تو ہم نے بھی سُر میں سُر ملا کر کہا کہ یہ پردہ تو نسوانیت کی تحقیر بلکہ اسلامی نظریۂ مساوات کی صریح خلاف ورزی ہے۔ وطنیت اور قومیت کے نظریے پیدا ہوئے تو ہم نے حب الوطن من الایمان سے اس کی تصدیق شروع کر دی۔ مصر میں اسی تخیل نے ہم سے فراعنہ پرستی کرائی، اسی کے عشق میں ایران وٹرکی نے اسلامی نظریۂ قومیت کے ایک ایک نشان کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر مٹایا اور وہاں کی دو ہزار برس پہلے کی مٹی ہوئی تہذیب کو زندہ کرنے میں اپنی سربلندی دیکھی۔ اسلامی قوانینِ حکومت کو چھوڑ کر مغرب کے بنائے ہوئے آئین و قانون اختیار کئے۔ حتیٰ کہ ترکی نے مغربی تصور کے اتباع میں اتنا بھی گوارا نہ کیا کہ وہاں کی حکومت نام کو بھی اسلامی خلافت رہ جائے۔ اور جب اس پر بھی صبر نہ ہو سکا تو اسلامی تصور کا رہا سہا داغ بھی اس نے اپنے دامن سے مٹا دیا، اور اس دفعہ کو، جس کے ذریعہ حکومت کا مذہب اسلام قرار پایا تھا، اڑا کر یہ دفعہ مرتب کی گئی کہ آئندہ سے ترکی حکومت اسلامی حکومت کے بجائے قومی اور جمہوری حکومت کہلائے گی۔

اسلامی تصورات سے یہ بُعد اور تنفر کچھ ایک سلطنت یا ملک تک محدود نہیں ہے۔ ممالک اسلامیہ میں سے جو بھی ترقی کا ولولہ لے کر اُٹھتا ہے کعبۂ فرنگ کی طرف منہ کر لیتا ہے، خواہ غلام ہو یا نام کا آزاد۔ آج قریب قریب تمام مسلمانوں نے اپنے دل و دماغ مغرب کے حوالہ کر دیے ہیں۔ مغربی نقطۂ نظر ہمارے نظامِ زندگی کے ایک ایک جزو میں سرایت کر گیا ہے۔ ہماری اجتماعی ذہنیت پر جاہلیتِ جدیدہ کا ایسا گہرا زنگ چڑھ گیا ہے کہ اسلامی نظریات کا کوئی نقش اس پر اترتا ہی نہیں۔ صبغۃ اللہ جس امت کا قومی نشان تھا وہ یورپین اصطباغ لینے کے لئے والہانہ دوڑی چلی جا رہی ہے۔ اس کے نزدیک اب صداقت کا معیار اور نجات و سربلندی کا ذریعہ مغربی قول و فعل ہے۔ گویا جس طرح قرآن

مہیمن تھا پچھلی کتابوں کی ناقص اور محرف تعلیمات کا، اب سمائے مغرب سے نازل ہونے والی وحی مہیمن ہے، (العیاذ باللہ)، قرآنی نظریات وتصورات کی۔ جاہلیت کی جو سب سے بڑی تمنا ہوسکتی ہے وہ یہی ہے جسے پورا کرنے کے لئے ہم جی رہے ہیں۔ امت مرحومہ کے اخلاف واسلاف میں اگر کوئی نسبت ہی تو یہی کہ ایک "طوبیٰ للغرباء" کی پیشین گوئی کا مظہر ہے، دوسرا "فسیعود غریباً" کی پیشین گوئی کا۔

لیکن ہاں مایوسی اور نامرادی کی اس ہمہ گیر تاریکی میں ابھی امید کی ایک کرن باقی ہے۔ باطل کی فطرت ثبات ناآشنا ہے۔ وہ پھیلنا جانتا ہے مگر ثابت قدم رہنا نہیں جانتا۔ متمدن انسان جاہلیت کے سیلاب میں بہ تو گیا مگر اس کے تھپیڑے کھا کھا کر موجودہ نظام تہذیب سے وہ پریشان بھی ہو رہا ہے۔ جہل پرستی کے تلخ نتائج ایک ایک کرکے اس کے سامنے آرہے ہیں اور وہ امن وسلامتی کی جستجو میں ہمہ گام ندوار سرگرداں ہے۔ مگر چونکہ اس کے سامنے عملی دنیا میں کہیں یہ شے اپنی اصلی صورت اور بے نقاب ہیئت میں موجود نہیں اس لئے جب کوشش کرکے جاہلیت کے ایک پھندے سے وہ اپنی گردن چھڑاتا ہے تو دوسرا پھندا اسے اپنے حلقہ میں لے لیتا ہے۔ امپیریلزم اور سرمایہ داری کی ظالمانہ سخت گیریوں سے گھبرایا تو اشتراکیت کی لعنت میں جا پھنسا۔ جمہوریت سے تنگ آیا تو ڈکٹیٹرشپ کی خندق میں جا گرا۔ نکاح وطلاق وغیرہ معاشرتی قوانین میں (جن کے بارے میں کل تک وہ اسلام پر خندہ زن تھا) اپنی غیر فطری اور خیالی بندشوں کو توڑ کر اباحتِ مطلقہ (Licentiousness) نسوانیت (Feminism) اور برتھ کنٹرول کے مہالک میں گرفتار ہو گیا۔ غرضیکہ ایک عام بیقراری اور اضطراب کے دور سے دنیا گذر رہی ہے۔ جاہلیت کے دباؤ سے اس کی روح بے تاب ہو رہی ہے۔ گویا زمین تیار ہو چکی ہے، بیج ڈالنے کی ضرورت ہے۔ سرابِ جاہلیت میں بھٹکتی ہوئی دنیا پیاس سے بے قرار ہے، کاش سینۂ عرب سے ابلتے ہوئے سرچشمۂ حیواں کو خس وخاشاک سے پاک کرکے اس کے سامنے کر دیا جائے۔ یعنی وہ اسلام جس سے ساری دنیا بیگانہ ہے اور جو ساری دنیا سے اجنبی جاہلی افکار وتصورات کے غبار میں چھپا پڑا ہے، پھر اسے

از سر نو دنیا سے مانوس اور اس کے الٰہی نظام کی برکتوں کو نمایاں کر کے دنیا سے روشناس کرایا جائے۔ آج ضرورت ہے اسلام کو ایسے ہی مردان کار اور اصحاب عزیمت کی جو مشرق و مغرب کی ذہنیتوں کے خلاف صف بستہ ہو سکتے ہوں اور تلاش ہے اسلام کو ایسے ہی "غرباء" کی جو ہوا پرستی اور جاہلیت کے اس طوفان میں قدم جما کر کھڑے ہو جائیں۔ اسلامی نظریات و تصورات کو اپنی زندگی کا رہنما بنائیں۔ قرآن کی روح میں جذب ہو جائیں اور اسلامی نظام حیات کو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر نافذ کر کے اسلام کے چہرہ سے غرابت کا پردہ اٹھا دیں۔ یہی تجدید ملت ہے۔ یہی احیاء دین ہے۔ یہی اعلاء کلمۃ اللہ ہے۔ یہی نصرتِ اسلام اور یہی وراثت رسول ہے۔ قدرت "طوبیٰ للغرباء" کی بشارت دینے کے لئے منتظر کھڑی پکار رہی ہے۔ اگر مسلمانوں کو اپنی کھوئی ہوئی عظمت کی جستجو ہے تو انہیں اس پکار کا جواب دینا پڑے گا۔

ضروری اطلاع

سررشتہ تعلیمات حیدرآباد دکن کی جانب سے ۱۸ مدارس اور دفاتر کے نام جو پرچے سالِ گذشتہ جاری کرائے گئے تھے ان کی مدت اِس ماہ رمضان میں ختم ہو رہی ہے۔ اب محکمۂ تعلیمات نے ہم کو اطلاع دی ہے کہ مذہبی و سیاسی پرچوں کی خریداری اس کی پالیسی کے خلاف ہے۔ لہذا آئندہ شوال سے یہ پرچہ ان مدارس و دفاتر میں حاضر نہ ہو گا۔ جو مدارس اسے خریدنا چاہیں وہ خود اپنے بجٹ سے خرید سکتے ہیں۔

منیجر

تنزیل و تاویل

قصہ داؤد علیہ السلام اور اسرائیلی خرافات

کچھ مدت ہوئی، ناظرین ترجمان القرآن میں سے ایک صاحب نے اس قصے کے متعلق اپنے شکوک کا اظہار کیا تھا جو سورۂ ص کے دوسرے رکوع میں حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق بیان ہوا ہے۔ اگرچہ ان کو ایک مختصر جواب بروقت دے دیا گیا، مگر بعد میں خیال آیا کہ یہ قصہ قرآنِ مجید کے ان مقامات میں سے ہے جن کے حسن و جمال کو اسرائیلی خرافات کے غبار نے اکثر لوگوں کی نظروں سے چھپا دیا ہے، اور جن کے متعلق عام طور پر متداول تفسیروں یا ترجموں کی مدد سے قرآنِ مجید کا مطالعہ کرنے والوں کو شبہات اور سخت شبہات پیش آتے ہیں، لہٰذا اس پر ایک مستقل مضمون لکھنے کی ضرورت ہے، تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ قصہ قرآنِ حکیم میں کس فائدے کے لئے بیان کیا گیا ہے، اور اس کا صحیح مفہوم کیا ہے۔

سورۂ ص اس مضمون سے شروع ہوتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام سن کر کفار ضد اور ہٹ دھرمی، اور تقلید آبائی کی بنا پر آپ کو جھٹلاتے ہیں، اور ان کے جواب میں اللہ تعالیٰ قوم نوحؑ، اور عاد، اور فرعون، اور ثمود اور قوم لوطؑ اور قوم شعیبؑ کا حوالہ دے کر انہیں متنبہ کرتا ہے کہ یاد رکھو! ہمارے قانون میں کسی کے لئے رو رعایت نہیں ہے، تم سے پہلے جس جس نے ہمارے فرمان سے سرتابی کی ہے اس کو سخت سزا دی جا چکی ہے، اور اب اگر تم سرکشی کرو گے تو کوئی چیز تم کو ہمارے عذاب سے نہ بچا سکے گی۔

اسی تنبیہ کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ آگے چل کر بیان فرماتا ہے کہ ہمارا قانون تو ایسا بے لاگ ہے کہ

معمولی درجہ کے انسان تو کیا چیز ہیں، بڑے بڑے عالی مرتبہ لوگ حتیٰ کہ نبی اور پیغمبر بھی اگر ہمارے مقرر کئے ہوئے طریقِ حق سے بال برابر جنبش کرتے ہیں تو ہم ان کو بھی گرفت کیے بغیر نہیں چھوڑتے۔ وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوُدَ۔ اے نبی! ان کو ذرا ہمارے خاص بندے داؤد کا حال سناؤ۔ یہ کس پائے کا شخص تھا؟ ذَا الْأَيْدِ۔ بڑی قوتوں کا مالک۔ بڑی نعمتوں سے سرفراز کیا ہوا۔ إِنَّهُ أَوَّابٌ۔ اور اس کے ساتھ نہایت خدا ترس۔ دائماً اپنے مالک کی طرف رجوع کرنے والا۔ إِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهُ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَالْإِشْرَاقِ وَالطَّيْرَ مَحْشُورَةً كُلٌّ لَهُ أَوَّابٌ۔ صبح و شام خدا کا ذکر اس جوش، اس جذبہ کے ساتھ کرتا تھا کہ پہاڑ اور پرندے تک اس کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتے تھے۔ وَشَدَدْنَا مُلْكَهُ وَآتَيْنَاهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ۔ ہم نے اس کو نہایت مضبوط، طاقتور سلطنت عطا کی تھی، حکمت اور دانشمندی کی نعمت سے نوازا تھا، اور اس کو فیصلہ کن بات کہنے کی قابلیت بخشی تھی۔ مگر تمھیں معلوم ہے کہ جب اس سے ایک معاملہ میں لغزش ہو گئی تو ہم نے کیا کیا؟۔

وَهَلْ أَتَاكَ نَبَأُ الْخَصْمِ ۔ إِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ، إِذْ دَخَلُوا عَلَىٰ دَاوُدَ فَفَزِعَ مِنْهُمْ، قَالُوا لَا تَخَفْ، خَصْمَانِ بَغَىٰ بَعْضُنَا عَلَىٰ بَعْضٍ فَاحْكُم بَيْنَنَا بِالْحَقِّ وَلَا تُشْطِطْ وَاهْدِنَا إِلَىٰ سَوَاءِ الصِّرَاطِ۔

کیا تمھیں ان مقدمہ والوں کی خبر پہنچی ہے جو دیوار پھاند کر داؤد کی خلوت گاہ میں گھس آئے تھے؟ ان کے اس طرح اچانک ایسی جگہ پہنچ جانے سے جب داؤد گھبرا گئے، تو انھوں نے کہا آپ پریشان نہ ہوں، ہم دو فریق مقدمہ ہیں جن میں سے ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہے۔ آپ ہمارے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دیں، حق سے تجاوز نہ کریں اور ہمیں عدل کا راستہ دکھائیں۔

مقدمہ کیا تھا؟ ایک فریق نے دوسرے فریق کی طرف اشارہ کر کے کہا:۔

إِنَّ هَٰذَا أَخِي لَهُ تِسْعٌ وَتِسْعُونَ نَعْجَةً وَلِيَ نَعْجَةٌ وَاحِدَةٌ۔ فَقَالَ أَكْفِلْنِيهَا وَعَزَّنِي فِي الْخِطَابِ۔

بیشک یہ میرا بھائی ہے دینی بھائی اور ہم قوم، اس کے پاس ۹۹ دنبیاں ہیں اور میرے پاس صرف ایک دنبی۔ یہ مجھ سے کہتا ہے کہ یہ اپنی ایک دنبی بھی مجھے دے دے۔ اور اس مطالبہ میں اپنی شان و

شوکت سے مجھے دبا لیتا ہے۔

داؤد علیہ السلام اس روداد مقدمہ کو سن کر فرماتے ہیں :-

قَالَ لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ إِلَىٰ نِعَاجِهِ وَإِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْخُلَطَاءِ لَيَبْغِي بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَقَلِيلٌ مَّا هُمْ۔

داؤد نے کہا، بلا شبہ اس شخص نے ظلم کیا کہ اتنی دنبیاں رکھتے ہوئے بھی تیری ایک دنبی مانگ بیٹھا۔ اور اکثر ہمسایوں کا یہی حال ہے کہ ایک دوسرے پر زیادتیاں کرتے ہیں، بجز ایسے لوگوں کے جو ایمان دار اور نیکوکار ہیں، مگر ایسے لوگ کم ہی ہیں

یہ فیصلہ دینے کے بعد حضرت داؤد کو یکایک خیال آیا کہ ایسی ہی ایک لغزش مجھ سے بھی ہو چکی ہے، چنانچہ فوراً وہ خدا کے خوف سے لرز اٹھے، اور توبہ و استغفار کرنے لگے :-

وَظَنَّ دَاوُودُ أَنَّمَا فَتَنَّاهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهُ وَخَرَّ رَاكِعًا وَأَنَابَ۔

داؤد کو معاً یہ گمان ہوا کہ یہ مقدمہ بھیج کر ہم نے اس کو آزمائش میں ڈالا ہے۔ چنانچہ اسی وقت اس نے اپنے پروردگار سے عفو و بخشش کی دعا کی، اور سجدے میں گر پڑا اور بار بار توبہ کی۔

جب حضرت داؤد نے اس طرح اپنی لغزش کا اعتراف کر لیا اور سچے دل سے توبہ کی تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ :-

فَغَفَرْنَا لَهُ ذَٰلِكَ وَإِنَّ لَهُ عِندَنَا لَزُلْفَىٰ وَحُسْنَ مَآبٍ۔

ہم نے اس کی وہ خطا معاف کر دی اور یقیناً وہ ہمارے ہاں مقرب ہے اور اس کی اچھی منزلت ہے۔

مگر اس کے ساتھ ہی ہم نے اس کو ان الفاظ میں سختی کے ساتھ تنبیہ کی کہ :-

يَا دَاوُودُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُم بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَىٰ فَيُضِلَّكَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ

اے داؤد! ہم نے تجھ کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے لہٰذا تو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ حکومت کر۔ اور اپنے نفس کی خواہشات کی پیروی نہ کر، کہ یہ خواہشات

اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ

کہیں تجھ کو خدا کے راستہ سے بھٹکا نہ دیں۔ جو لوگ اللہ کے راستے سے بھٹکتے ہیں، یقیناً ان کے لئے سخت عذاب ہے، کیونکہ وہ روزِ حساب کو بھول گئے۔

جیسا کہ اوپر بیان کر چکا ہوں، اس قصے کو بیان کرنے کا اصل مقصد یہ ہے کہ جو لوگ خدا سے بے خوف اور اس کے بے لاگ قانون سے ناواقف ہیں، انہیں متنبہ کر دیا جائے کہ اس احکم الحاکمین کے ہاں کسی کی ساتھ رو رعایت نہیں۔ اس کے قانون سے بال برابر انحراف بھی اگر ہو گا تو اس پر گرفت ضرور ہوگی، اور کوئی بڑی سے بڑی شخصیت بھی اس کی گرفت سے نہ بچے گی، اِلّا یہ کہ سچے دل سے توبہ کرے، اخلاص کے ساتھ اس کی جناب میں رجوع لائے اور اپنے آقا کے مقابلہ میں کبر کے بجائے عجز اختیار کرے۔ لیکن اس کے ساتھ ایک اور مقصد بھی ہے جس کے لئے یہ قصہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، اور وہ ایک جلیل القدر نبی کے حق میں یہود کی غلط بیانیوں کو دور کرنا ہے۔

یہود کے متعلق معلوم ہے کہ انھوں نے خود اپنی قوم کے انبیاء پر ناپاک الزامات لگانے، اور ان کی سیرتوں کو داغدار کرنے میں بھی کوئی تامل نہیں کیا ہے۔ حضرت ابراہیم، حضرت لوط، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب، حضرت یوسف، حضرت موسیٰ، غرض کوئی ان کی بدگوئیوں سے نہ بچ سکا۔ لیکن سب سے زیادہ ظلم انھوں نے حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام پر کیا کہ ان کو انبیاء کی صف سے نکال کر معمولی پادشاہوں کی صف میں اتار لائے، اور ان کو اس حیثیت سے پیش کیا کہ وہ ڈپلومیٹ ہیں، فاتح اور مدبر ہیں، جھوٹ، فریب، ظلم، اور ان تمام وسائل سے توسیع مملکت کرتے ہیں جن سے دنیا کے دوسرے فاتحوں اور جہانگیروں نے کام لیا ہے، اور اپنے نفس کی خواہشات پوری کرنے کے لئے وہ سب کچھ کر گذرتے ہیں جو عام بادشاہوں کا شیوہ ہے۔ حد یہ ہے کہ انھوں نے حضرت داؤد پر زنا اور حضرت سلیمان پر شرک اور ساحری کا الزام لگانے میں بھی باک

نہیں کیا۔ یہ اس قوم کا برتاؤ اُن بزرگوں کے ساتھ ہے جنھوں نے اس کو ذلت کی خاک سے اٹھا کر عزت کے آسمان پر پہنچایا۔ آج جن تاریخی مفاخر پر یہ قوم ناز کرتی ہے وہ سب انہی بزرگوں کی بدولت اسے نصیب ہوئے ہیں، اور انہی کی پاک سیرتوں پر اس نے سیاہی کے چھینٹے پھینکے ہیں۔

دنیا میں صرف ایک قرآن ہی ایسی کتاب ہے جس نے ان انبیاء کرام میں سے ایک ایک کی پوزیشن صاف کی، اور ان کے اصل مرتبہ و مقام سے دنیا کو روشناس کیا۔ اگر قرآن نہ آتا تو آج کوئی شخص ان بزرگوں کو نبی ماننا تو درکنار، عزت سے ان کے نام لینا بھی گوارا نہ کرتا۔ بنی اسرائیل چاہے اس احسان کو نہ مانیں، مگر احسان کا احسان ہونا اس کا محتاج نہیں کہ اس کا اعتراف بھی ہو۔

سیدنا داؤد علیہ السلام کے متعلق یہود کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ وہ ان کی نبوت ہی کے قائل نہیں ہیں، بلکہ ان کو محض اپنی قوم کا ایک ہیرو سمجھتے ہیں۔ قرآن اس کی اصلاح کرتے ہوئے بیان کرتا ہے کہ وہ ایک جلیل القدر نبی تھے، اور اللہ نے ان کو بڑا مرتبہ عطا فرمایا تھا۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذریت کے سلسلہ میں وہ حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کا بھی ذکر کرتا ہے اور پھر کہتا ہے کہ کُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ۔ "یہ سب صالح لوگ تھے"۔ کُلًّا فَضَّلْنَا عَلَی الْعٰلَمِیْنَ۔ "ان سب کو ہم نے دنیا جہان والوں پر فضیلت عطا کی"۔ وَاجْتَبَیْنٰھُمْ وَھَدَیْنٰھُمْ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ "اور ہم نے ان کو برگزیدہ کیا اور ایک سیدھے راستے کی طرف ان کی رہنمائی کی"۔ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحُکْمَ وَالنُّبُوَّۃَ۔ "یہ وہ لوگ ہیں جن کو ہم نے کتاب اور حکم اور نبوت سے سرفراز کیا"۔ اور یہ سب کچھ کہہ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کرتا ہے کہ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ ھَدَی اللّٰہُ فَبِھُدٰھُمُ اقْتَدِہْ۔ "ان لوگوں کو اللہ نے راہِ راست دکھائی تھی، لہٰذا جس راستے پر وہ چلے ہیں اس پر تم بھی چلو"۔ (الانعام- ۱۰)

دوسرا زبردست داغ جو حضرت داؤد کی سیرت پر یہودیوں نے لگایا ہے، وہ اوریا حتّی

کی بیوی کے معاملہ میں ہے۔ کتاب صموئیل دوم باب ۱۱ و ۱۲ میں اس کی پوری تفصیل درج ہے جس کا خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے :۔

"ایک روز شام کے وقت داؤد اپنے محل کی چھت پر ٹہل رہا تھا کہ اس کی نظر ایک عورت پر پڑی جو نہا رہی تھی۔ بے حد خوبصورت عورت تھی۔ داؤد نے دریافت کرایا کہ یہ کون ہے؟ معلوم ہوا بتشیبع بنت الیعام اس کا نام ہے، اور یاحتی کی بیوی ہے۔ داؤد نے اس کو بلا بھیجا اور رات اپنے پاس رکھا۔ اسی رات وہ حاملہ ہو گئی اور بعد میں داؤد کو اس نے اپنے حمل کی اطلاع دے دی۔

"اس کے بعد داؤد نے اُوریا کو یوآب کے پاس بھیج دیا جو اس وقت بنی عمون سے لڑ رہا تھا، اور شہر ربّہ کا محاصرہ کیے پڑا تھا۔ اس نے یوآب کو لکھا کہ اُوریا کو جنگ میں کسی ایسی جگہ مامور کر جہاں سخت معرکہ ہو اور پھر اس کو چھوڑ کر الگ ہو جا تاکہ وہ مارا جائے۔ چنانچہ یوآب نے ایسا ہی کیا اور وہ لڑائی میں مارا گیا۔

"اس طرح اوریا کو ٹھکانے لگانے کے بعد داؤد نے اس عورت سے نکاح کر لیا اور اسی کے پیٹ سے سلیمان پیدا ہوا۔

"خدا کو داؤد کا یہ فعل ناگوار ہوا اور اس نے ناتن نبی کو داؤد کے پاس بھیجا۔ ناتن نے اس سے کہا کہ ایک شہر میں دو شخص تھے۔ ایک مالدار تھا۔ دوسرا فقیر۔ مالدار شخص کے پاس بہت سی بکریاں اور گائیں تھیں۔ فقیر کے پاس صرف ایک چھوٹی سی دنبی تھی جس کو وہ بڑی محبت سے پالتا تھا۔ ایک مرتبہ مالدار شخص کے پاس کچھ مہمان آئے۔ اس نے نہ چاہا کہ اپنی بکریوں اور گایوں میں سے کسی کو کاٹے۔ فقیر کی دنبی لے لی اور اس سے ضیافت کا سامان کیا۔ یہ قصہ سُن کر داؤد بہت غضبناک ہوا اور کہا کہ ایسا شخص ضرور مارا جائے گا اور اس فقیر کو ایک کے بدلے چار

ڈنبیاں دلوائی جائیں گی۔ ناتن نبی نے کہا کہ وہ شخص تو ہی ہے، اور اسے اوریا حتی کا واقعہ یاد دلایا۔"

اس قصے میں حضرت داؤد علیہ السلام کی اخلاق کی ایسی تصویر کھینچی گئی ہے جو ایک نبی تو درکنار، ایک معمولی بادشاہ کے لئے بھی انتہائی شرمناک ہے۔ یہودیوں میں یہ قصہ بچے بچے کی زبان پر چڑھا ہوا تھا۔ حضرت داؤد کی زندگی کے نمایاں واقعات میں اس کو شمار کیا جاتا تھا، اس پر عجیب عجیب حاشیے چڑھائے گئے تھے، اور مزے لے لے کر اس کو بیان کیا جاتا تھا۔ غیر ممکن تھا کہ قرآن ایک عالی مرتبہ پیغمبر کی سیرت پر اس داغ کو گوارا کرتا۔ اس نے مذکورۂ بالا آیات میں حکمت و موعظت کا درس دینے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ اصل واقعہ کیا ہے اور اس پر جھوٹے حاشیے کتنے چڑھائے گئے ہیں۔

قرآن مجید کے بیان سے واقعہ کی حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ سیدنا داؤد علیہ السلام نے اوریا (یا جو کچھ بھی اس کا نام رہا ہو) سے محض یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے۔ ان کی شخصی عظمت کو پیشِ نظر رکھ کر وہ ایک طرح سے اپنے آپ کو طلاق دینے پر مجبور پا رہا تھا، مگر قبل اس کے کہ وہ طلاق دیتا، قوم کے دو نیک آدمی حضرت داؤد کے پاس اچانک پہنچ گئے، اور انھوں نے اس معاملہ کو ایک فرضی مقدمہ کی صورت میں ان کے سامنے پیش کیا۔ مقدمہ سن کر حضرتِ داؤد نے وہی فیصلہ دیا جو ایسے معاملہ کا برحق فیصلہ ہو سکتا تھا، لیکن معاً ان کو خیال آیا کہ یہ تو میرا دیہ میری آزمائش کر رہا ہے، چنانچہ فوراً انھوں نے توبہ کی اور غایت درجہ کی عاجزی کے ساتھ خدا سے اپنے قصور کی بخشش چاہی۔

اس بیان کو سامنے رکھ کر جب ہم توراۃ کی روایت کو دیکھتے ہیں تو بادنیٰ تامل یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ اصل واقعہ جب مشہور ہوا ہو گا تو اس پر حاشیے کس طرح چڑھ گئے ہوں گے۔

شریر النفس اور خبیث طینت لوگوں کا قاعدہ ہے کہ جب کسی آدمی اور خصوصاً بڑے آدمی کے متعلق کسی چھوٹی سی بات کی بھنک ان کے کان میں پڑ جاتی ہے تو فوراً ان کی قوتِ متخیلہ اپنا کام شروع کر دیتی

ہے۔ اور وہ محض اپنے ذہن سے بہت سی امکانی صورتیں فرض کر کے ان کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ گویا یہ محقق واقعات ہیں۔ ہر انسان سے خواہ وہ کیسے ہی بڑے درجہ کا آدمی ہو، کبھی نہ کبھی کوئی ایسا فعل ضرور ہو جاتا ہے جس کو آسانی کے ساتھ برے معنی پہنائے جا سکتے ہیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے جو کچھ کیا تھا اگرچہ وہ بنی اسرائیل کے ہاں ایک عام دستور تھا[1]، اور اسی دستور سے متاثر ہو کر نبی اللہ سے یہ لغزش سرزد ہوئی تھی، مگر چونکہ ایک بڑے آدمی کا فعل تھا، اس لئے فوراً شہرت پکڑ گیا، اور اس پر لوگوں نے حاشیے چڑھانے شروع کر دیے۔ اُوریاہ سے طلاق کا مطالبہ کرنا یہ گمان کرنے کے لئے کافی تھا کہ حضرت داؤد اس کی بیوی کی طرف میلان رکھتے ہیں۔ اب لوگوں کے ذہن نے ٹٹولنا شروع کیا کہ یہ میلان آخر ہوا کیونکر؟ کسی ذاتِ شریف کو یہ بات سوجھ گئی کہ غالباً اپنے محل پر سے اس کو نہاتے میں دیکھ لیا ہو گا۔ مگر ان کی قوتِ سامعہ نے "ہو گا" کو محض "ہو گا" کی صورت میں بیان کرنا پسند نہ کیا، اس لئے انھوں نے "ہو گا" کو "ہے" میں تبدیل کر کے لوگوں سے بیان کیا۔ رفتہ رفتہ یہ ایک واقعہ بن گیا حالانکہ میلان ہونے کے بہت سے اسباب ہو سکتے تھے۔ ممکن ہے کہ حضرت داؤد نے اس عورت کی قابلیت اور اس کی اعلیٰ صلاحیتوں کا حال سن کر اسے پسند کیا ہو لیکن برے نفوس کی شرارت ہمیشہ ایسے واقعات میں برے امکانات ہی کی طرف مائل ہوتی ہے۔

پھر جب لوگوں کو یقین ہو گیا کہ حضرت داؤد اس عورت کی طرف مائل ہیں، تو ان کی نالائق فطرت یہ بات ماننے کے لئے کسی طرح تیار نہ ہوئی کہ ایک بادشاہ کسی عورت کی طرف مائل ہو، اور وہ اس کو حاصل نہ کرے۔ چنانچہ انھوں نے یہ بھی فرض کر لیا کہ بادشاہ نے اس عورت کو بلایا ہو گا اور اس سے زنا کی ہو گی۔

---

[1] اسرائیلیوں کے ہاں یہ کوئی معیوب بات نہ تھی کہ کوئی شخص کسی کی بیوی کو پسند کر کے اس سے طلاق کی درخواست کرے۔ نہ درخواست کرنے والا اس میں تکلف کرتا تھا، اور نہ وہ شخص جس سے درخواست کی جاتی، اس پر برا مانتا تھا۔ اور یہ تو ایک عمدہ اخلاق کی بات سمجھی جاتی تھی کہ کوئی شخص کسی دوست کو خوش کرنے یا اس کی تکلیف رفع کرنے کے لئے اپنی بیوی کو طلاق دے کر اس کے نکاح میں دیدے۔ چنانچہ یہودی اخلاق ہی کا اثر تھا کہ مدینہ میں بعض انصار اپنے مہاجر بھائیوں کی مواسات کے لئے اپنی بیویوں کو طلاق دے کر ان سے بیاہ دینے پر آمادہ ہو گئے تھے۔

"یہ ہوگا" بھی بہت جلدی "ہے" میں تبدیل ہوگیا اور اس پر حمل کا مزید حاشیہ چڑھا دیا گیا۔

اسرائیلی قوم اس وقت تک ایک زندہ قوم تھی، اور اس میں ایسے لوگ بھی موجود تھے جو کسی بڑے سے بڑے آدمی کو بھی اس کی غلطی پر ٹوکنے میں تامل نہیں کرتے۔ جب یہ قصہ مشہور ہوا تو اس قسم کے لوگوں میں سے دو آدمی حضرت داؤد کے پاس پہنچ گئے اور انھوں نے تمثیل کے پیرایہ میں ان کو متنبہ کیا۔ چنانچہ آنجناب فوراً اپنے فعل سے تائب ہوگئے۔ لیکن یا تو اس توبہ کا علم لوگوں کو نہیں ہوا، یا اگر ہوا بھی تو بدفطرت لوگوں کو اس کا یقین نہ آیا۔ بہرحال توبہ کے بعد حضرت داؤد تو اپنی جگہ اوریاہ کی بیوی کا خیال چھوڑ چکے تھے، مگر لوگوں نے اس کا خیال نہ چھوڑا۔ اوریاہ ایک فوجی افسر تھا۔ اس کا کسی مہم پر جانا کوئی انوکھا فعل نہ تھا، اور جنگ میں اس کا مارا جانا بھی کوئی نرالی بات نہ تھی۔ مگر چونکہ لوگوں کے ذہن میں وہ واقعہ تازہ تھا، اور وہ ایک نبی کی بادشاہت اور ایک نفس پرست آدمی کی بادشاہت میں فرق کرنے سے اپنی طبیعت کی افتاد کی بنا پر عاجز تھے، اس لئے جب اوریاہ جنگ میں گیا اور مارا گیا، تو انھوں نے اس طرح قیاس قائم کیا کہ داؤد علیہ السلام اس کی بیوی پر مائل تھے، اور وہ بادشاہ ہونے کی حیثیت سے اوریاہ کا قصہ پاک کرکے اس کی بیوی کو حاصل کرنے پر قدرت بھی رکھتے تھے، اس لئے ضرور انھوں نے قصداً اوریاہ کو جنگ پر بھیجا ہوگا، اور قصداً ایسی تدبیر کی ہوگی کہ وہ مارا جائے۔ "یہ ہوگا" بھی بآسانی "ہے" میں تبدیل کر دیا گیا، اور بڑھتے بڑھتے یوآب کو خط لکھنے کا قصہ تصنیف ہوگیا۔

کوئی شخص کسی عورت کو پسند کرتا ہو، اور وہ عورت بیوہ ہو جائے، تو اس شخص کا اس عورت سے نکاح کر لینا کوئی نرالی یا معیوب بات نہیں ہے۔ مگر جب حضرت داؤد نے بتشبع سے نکاح کیا (جیسا کہ توراۃ کا بیان ہے) تو اسرائیلی عوام نے سمجھا کہ یہ ان تمام افواہوں کی صداقت کا قطعی ثبوت ہے جو اس سلسلہ میں اڑ رہی تھیں۔ یہاں پھر اسرائیلیوں نے اپنی اصلی طینت کا اظہار کیا۔ گو ایسے معاملہ میں ہمیشہ دو مساوی الدرجہ امکان ہوا کرتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک شخص نے اپنی پسندیدہ عورت کو

حاصل کرنے کی کوئی کوشش نہ کی ہو، اور اس کے بیوہ ہوجانے کے بعد کوئی اخلاقی و قانونی مانع نہ پاکر اس سے نکاح کرلیا ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے اسے حاصل کرنے کے لئے مجرمانہ تدبیریں کی ہوں۔ کسی شہادت کی غیر موجودگی میں ایک امکان کو دوسرے امکان پر قطعی ترجیح نہیں دی جاسکتی۔ لیکن ایسے مواقع پر انسان کی طینت اپنے آپ کو بے نقاب کرتی ہے۔ نیک طینت آدمی کا میلان ہمیشہ اچھے امکان کی طرف ہوتا ہے، اور اگر وہ شخص جس سے ایسا واقعہ متعلق ہو، صالح اور نیک چلن ہو تو نیک طینت آدمی یہی حکم لگائے گا کہ اس کا دامن پاک ہے۔ لیکن بدطینت آدمی ہمیشہ ہر طرف گندگی ہی گندگی ڈھونڈتا ہے۔ اس کی فطرت خود گندگی مانگتی ہے، اس لئے ایسے معاملات میں وہ ہمیشہ برے امکان ہی کو ترجیح دیتا ہے، حتیٰ کہ اگر شہادت سے اس کی تردید ہوجائے، تب بھی اندر سے اس کا دل نہیں مانتا۔

یہاں پہنچ کر قرآن اور بائیبل کا فرق اتنا نمایاں ہوجاتا ہے جتنا روشنی اور تاریکی کا فرق ہے۔ قرآن بنی اسرائیل کے ایک ہیرو کی زندگی کو روشن کرکے دکھاتا ہے، اور اس کے دامن پر ایک معمولی لغزش کا داغ بھی دھوئے بغیر نہیں چھوڑتا۔ مگر خود بنی اسرائیل جس کتاب کو کتاب مقدس کہہ کر پیش کرتے ہیں، وہ ان کے ہیرو کی وہ تصویر بھی پیش نہیں کرتی جو پاک طینت انسانوں کے ذہن میں آنی چاہئے، بلکہ ایسی تصویر پیش کرتی ہے جیسے اس قوم کے نہایت بدطینت سفہاء نے کھینچا تھا! یہودی اور عیسائی اس کتاب کو خدا کی کتاب کہتے ہیں، حالانکہ اس میں ایک جگہ نہیں سیکڑوں مقامات پر ایسے بیانات اور ایسے خیالات ملتے ہیں جو خدا تو درکنار، شریف انسانوں کے نفس کی بھی ترجمانی نہیں کرتے۔

اسرائیلی کیرکٹر کے کمالات یہیں ختم نہیں ہوتے۔ اس کی معراج آپ کو دیکھنی ہو تو یہ دیکھئے کہ جب قرآن نے اس قوم کے انبیاء کی صفائی پیش کی، اور اس کا لگایا ہوا ایک ایک داغ ان کے دامنوں پر سے دھویا، تو یہ خوش ہونے کے بجائے الٹے کبیدہ خاطر ہوئے، احسان مند ہونے کے بجائے مقابلے پر اتر آئے، اور انہوں نے ان سب دامنوں کو جنہیں قرآن نے دھویا تھا، پھر سے داغدار کرنے کی کوشش کی۔ قرآن جب نازل ہوا

تو مدینہ میں یہودی موجود تھے، اور نزول قرآن کے چند سال بعد جب مسلمان ایشیا اور افریقہ کے وسیع علاقوں پر پھیلے تو یہودیوں کی ایک کثیر تعداد کو ان سے میل جول کا موقع ملا۔ ان لوگوں نے ہر نبی کے متعلق وہی تمام پرانے قصے جو ان کے ہاں مشہور تھے، مسلمانوں میں بھی پھیلا دیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قرآنِ مجید کی بہت سی تفسیریں جو مسلمانوں نے لکھیں، ان کے اثر سے مسموم ہو کر رہ گئیں۔ یہ معاملہ متداول تفاسیر کا مطالعہ کرنے والوں سے پوشیدہ نہیں ہے، اور حضرت داؤد کے قصے میں بھی یہی صورت پیش آئی ہے۔ مدینہ کی یہودی بیوی اوریاہ کی بیوی کا قصہ اس کثرت سے مسلمانوں میں پھیلایا تھا کہ عام طور پر لوگ قرآنِ پاک کے اس رکوع کی تفسیر، توراۃ اور اسرائیلی خرافات ہی کے رنگ میں کرنے لگے تھے، حتیٰ کہ قرآن کی معنوی تحریف کا اندیشہ پیدا ہو گیا۔ آخر کار سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو یہ اعلان کرانے کی ضرورت پیش آئی کہ جو شخص اوریاہ حتّی کا قصہ روایت کرے گا اس کو ۱۶۰ کوڑے لگائے جائیں گے، سو کوڑے حدِ قذف کے، اور مزید ۶۰ کوڑے ایک نبی کی توہین کے۔[۱]

اب ہم ان تاویلات پر ایک نظر ڈالیں گے جو اس قصہ کے سلسلہ میں مفسرین نے بیان کی ہیں:۔

(۱) عام طور پر مفسرین اور اہل الروایت وہی اوریاہ کا قصہ بیان کرتے ہیں جو یہودیوں سے منقول ہے، اور ان کے نزدیک داؤد علیہ السلام سے وہی معصیت کبریٰ سرزد ہوئی تھی، جس سے انھوں نے استغفار کیا لیکن قرآن کے الفاظ اس تاویل کا ساتھ نہیں دیتے۔ قرآن نے مستغیث کا جو بیان نقل کیا ہے۔ اس میں وہ صرف یہ کہتا ہے کہ قَالَ أَكْفِلْنِيهَا وَعَزَّنِي فِي الْخِطَابِ (اس نے کہا کہ اپنی یہ دنبی بھی مجھے دیدے، اور گفتگو میں اپنی شان و شوکت سے مجھے دبا لیا) یہ نہیں کہتا کہ اس نے دنبی مجھ سے چھین لی یا مجھ کو قتل کرا کر چھیننے کی تدبیر کی۔

(۲) بعض حضرات نے لکھا ہے کہ اوریاہ سے بتشبع کی صرف منگنی ہوئی تھی اور حضرت داؤد کا قصور

---

[۱] ملاحظہ ہو کشاف، تفسیر کبیر اور تفسیر بیضاوی۔

یہ تھا کہ انھوں نے اپنے ایک مسلمان بھائی کی منگنی پر اپنی منگنی بھیجی لیکن قرآن کے الفاظ اس کی تائید نہیں کرتے تمثیل میں لی نعجۃ کا لفظ آیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ دنبی اس کی ملک تھی۔ یہ نہیں کہ وہ اس کو خریدنا چاہتا تھا، اور اس کے مالدار بھائی نے اس کی بولی پر بولی دیدی۔

(۳) بعض مفسرین کے نزدیک حضرت داؤد کی لغزش یہ تھی کہ جب اس عورت کا شوہر مارا گیا تو ان کو وہ رنج نہ ہوا جو ہونا چاہئے تھا محض اس لئے کہ وہ اس عورت کی طرف میلان رکھتے تھے لیکن یہ ایک بے سروپا بات ہے، اور اس سے وہ تمثیل بالکل بے معنی ہو جاتی ہے جو متخاصمین کی زبان سے بیان ہوئی ہے۔

(۴) ایک جماعت کا خیال یہ ہے کہ عورت کے قصہ کی سرے سے کوئی اصلیت ہی نہیں ہے۔ دراصل حضرت داؤد کے قتل کی سازش ہوئی تھی اور کچھ لوگ دیوار پھاند کر آگئے تھے۔ مگر جب حضرت داؤد متنبہ ہو گئے تو انھوں نے محض بات بنانے کے لئے یہ مقدمہ گھڑ لیا۔ حضرت داؤد ان کی نیت تاڑ گئے اور انھوں نے ان لوگوں سے انتقام لینا چاہا۔ پھر بعد میں یا تو وہ اس بنا پر نادم ہوئے کہ انتقام کی خواہش ہی ان کے مرتبے سے گری ہوئی چیز تھی، یا اس پر نادم ہوئے کہ بغیر کسی ثبوت کے انھوں نے محض گمان پر ان لوگوں کو دشمن سمجھ لیا اور انہیں سزا دینی چاہی۔ بہرحال ان دو وجوہ میں سے کوئی ایک وجہ تھی جس پر انہیں ندامت ہوئی اور انھوں نے توبہ و استغفار کیا۔ لیکن اس تاویل پر متعدد اعتراض وارد ہوتے ہیں:۔

اولاً، یہ کوئی ایسا اہم واقعہ نہیں کہ قرآن میں اس موقع پر اس شان سے اس کا ذکر ہوتا۔

ثانیاً، قرآن میں کوئی لفظ اس واقعہ پر دلالت نہیں کرتا کہ یہ لوگ قتل کے لئے آئے تھے اور حضرت داؤد اس بات پر نادم ہوئے تھے کہ انھوں نے ان سے انتقام لینا چاہا تھا یا بلا ثبوت ان پر بدگمانی کی تھی۔

ثالثاً، قرآن کی عبارت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اپنا فیصلہ سناتے ہی حضرت داؤد کو یہ گمان ہوا کہ ان کے رب نے ان کو آزمائش میں ڈالا ہے۔ اس سے متبادر یہی ہوتا ہے کہ اس تمثیل اور

اس فیصلہ کا آزمائش سے کوئی تعلق ضرور تھا اور اسی پر انھوں نے استغفار کیا۔

رابعاً، اگر وہ لوگ حقیقت میں دشمن تھے اور قتل کی نیت سے آئے تھے تو ان سے انتقام لینے کی خواہش ناجائز نہ تھی اور اس پر وہ تنبیہ غیر ضروری تھی جو یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰکَ خَلِیْفَۃً الخ میں کی گئی ہے۔ اور اگر وہ دشمن نہ تھے تو ان کا تمثیلی مقدمہ محض بات بنانے پر محمول نہیں کیا جا سکتا، بلکہ اس میں لامحالہ کوئی معنویت ہونی چاہیے۔

(۵) بعض مفسرین کا خیال ہے کہ حضرت داؤد نے دراصل اپنے لئے استغفار نہیں کیا تھا بلکہ ان لوگوں کے لئے استغفار کیا تھا جو ان کے قتل کو آئے تھے۔ لیکن اس صورت میں آزمائش کا ذکر بے معنی ہو جاتا ہے، اور یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰکَ خَلِیْفَۃً کی تنبیہ قطعاً بے محل ٹھیرتی ہے۔

(۶) موجودہ زمانہ کے بعض مفسرین کہتے ہیں کہ استغفار دراصل قاتلوں کے لئے نہ تھا بلکہ جب حضرت داؤد نے دیکھا کہ یہ لوگ قتل کے لئے آئے ہیں تو انھوں نے اللہ سے حفاظت اور پناہ کی دعا کی تھی۔ اس تاویل کی بنا یہ ہے کہ وہ استغفار کو لغوی معنوں میں لیتے ہیں، یعنی "اس امر کی دعا کہ اللہ ان کو اپنی حفظ و امان میں چھپا لے"۔ مگر اول تو یہ تاویل عربیت کے خلاف ہے، دوسرے یہ نہایت رکیک بات ہے کہ داؤد علیہ السلام جیسا بہادر سپاہی محض دو دشمنوں کو دیکھ کر مقابلہ کرنے کے بجائے رکوع و سجود میں لگ جائے، تیسرے اس تاویل میں ظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ اور فَغَفَرْنَا لَهٗ ذٰلِکَ اور یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰکَ خَلِیْفَۃً الخ کے فقرے بے معنی ہو جاتے ہیں۔

(۷) بعض حضرات کے نزدیک حضرت داؤد کی لغزش یہ تھی کہ انھوں نے محض ایک فریق کا بیان سن کر فیصلہ صادر کر دیا اور دوسرے فریق کا بیان نہ لیا۔ لیکن یہ تاویل بھی مہمل ہے، کیونکہ اول تو قرآن میں دوسرے فریق کا بیان درج نہ ہونے سے لازماً یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ اس کا بیان نہیں لیا گیا۔ ممکن ہے کہ اس نے اقرار کر لیا ہو، اس لئے اس کے ذکر کی ضرورت ہی نہ سمجھی گئی ہو،

اور قرآن کا یہ عام انداز بیان ہے کہ وہ کسی واقعہ کی غیر ضروری تفصیلات نہیں دیتا بلکہ صرف مطلب کی بات بیان کر دیتا ہے۔ دوسرے اس تاویل کے لحاظ سے وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (اپنی خواہش نفس کی پیروی نہ کر کہیں یہ تجھ کو خدا کے راستہ سے بھٹکا نہ دے) کی تنبیہ بے محل ہو جاتی ہے، کیونکہ ایک فریق کا بیان سُن کر فیصلہ کر دینے میں حضرت داؤد کا کوئی ذاتی مفاد وابستہ نہ تھا کہ اس سے اتباع ہوٰی لازم آئے۔ زیادہ سے زیادہ اس کو اصولِ عدالت سے ایک نادانستہ انحراف کہا جاسکتا ہے جس پر تنبیہ کی دوسری صورت ہونی چاہیے تھی۔

(۸) کچھ لوگوں نے ایک دوسری ہی تاویل کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے اوقات کو چار حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ ایک دن محض عبادت کرتے تھے۔ ایک دن مقدمات کے فیصلے فرماتے تھے۔ ایک دن اپنے خانگی معاملات کو دیکھتے تھے۔ اور ایک دن بنی اسرائیل کو وعظ و تلقین کرتے تھے۔ یہ تقسیم چونکہ وحی الٰہی کے بغیر کی گئی تھی، اور نبی کو وحی کے خلاف کوئی کام نہ کرنا چاہیے اس لئے، اور اس لئے کہ نبی کو زیادہ تر اپنا وقت وعظ و نصیحت اور فصل معاملات میں صرف کرنا چاہیے، اللہ تعالیٰ نے ان کو تنبیہ فرمائی۔ لیکن اس تاویل میں متعدد کمزوریاں ہیں:۔

اولاً، تقسیم اوقات کی روایت محض ایک شاذ روایت ہے جو بعض مفسرین نے حضرت ابن عباس سے نقل کی ہے۔ اور خود حضرت ابن عباس سے جو قوی روایتیں مسروق اور سعید بن جبیر نے نقل کی ہیں وہ اُس تاویل کی تائید کرتی ہیں جو ہم نے اختیار کی ہے، یعنی ما زاد داؤد علی ان قال انزل لی عنھا (حضرت داؤد نے اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا تھا کہ اس سے طلاق کی درخواست کی)۔ اسی کی تائید قرآن کے الفاظ قَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ سے بھی ہوتی ہے۔

ثانیاً، اگر کسی شخص کے پیشِ نظر حضرت ابن عباس کی یہ رِوایت نہ ہو تو وہ صرف یہی نہیں کہ قرآن مجید کی ان آیات کا یہ مطلب نہیں سمجھ سکتا، بلکہ ظاہر الفاظ سے وہ اس کے بالکل خلاف مطلب نکالے گا۔ یہ

بات کتابِ الٰہی تو درکنار معمولی انسانی تصنیفوں کے لئے بھی معیوب ہے کہ اس کے اپنے الفاظ اس کا مدعا ظاہر کرنے سے اس درجہ قاصر ہوں کہ اگر ایک خاص روایت اس کی تشریح کرنے والی سامنے نہ ہو تو ناظر اس کا بالکل الٹا مطلب لے نکلے۔ روایت اگر اصل متن کے متبادر مفہوم کی مزید تشریح کرتی ہو تو اس کے مفید ہونے میں کلام نہیں لیکن اگر وہ متبادر مفہوم سے ہٹا کر بات کو کسی اور طرف پھیرے جائے تو ایسی روایت کو شارح کے بجائے متمم کہنا پڑے گا، اور اس سے لازم آئے گا کہ اس متمم کے بغیر قرآن ناقص ہے۔

ثالثاً، خود حضرت ابن عباس نے بھی اپنی اس روایت کو وجہ عتاب کی تفسیر میں بیان نہیں کیا ہے بلکہ صرف اس امر کی تشریح میں بیان کیا ہے کہ خصمین کو دیوار پھاند کر محراب میں جانے کی ضرورت کیا پیش آئی تھی۔ اس کی شرح میں وہ بیان فرماتے ہیں کہ وہ دن حضرت داؤد کی عبادت کا تھا اور وہ اپنی محراب میں تشریف رکھتے تھے جو ان کے مکان کے بالائی حصہ میں واقع تھی۔ باقی رہی یہ بات کہ عبادت کے لئے ایک دن مخصوص کرنے پر اللہ تعالیٰ نے عتاب فرمایا تھا، تو اس کا اشارہ تک ابن عباسؓ کی روایت میں نہیں ہے۔

رابعاً، اگر بات یہی تھی جو یہ مفسرین بیان کرتے ہیں تو خصمین کے پورے مقدمہ کو نقل کرنے کی کوئی حاجت نہ تھی۔ یہ بات قرآن کے اسلوب کے خلاف ہے کہ وہ کسی واقعہ کی ایسی تفصیلات نقل کرے جن سے اصل مقصود پر کوئی روشنی نہ پڑتی ہو۔ اس مقصد کے لئے صرف یہ بیان کرنا کافی ہو جاتا کہ لوگ ایک دوسرے پر ظلم کرنے لگے اور اس قسم کا ایک معاملہ ہم نے داؤد کو متنبہ کرنے کے لئے اس کے پاس بھی بھیج دیا۔

خامساً، عبادت میں افراط اور کثرت ایسی چیز نہیں ہے جس کو "ہویٰ" سے تعبیر کیا جائے۔ قرآن نے کہیں بھی اس فعل کو ہوائے نفس کی طرف منسوب نہیں کیا ہے، اور نہ کوئی ایک مثال ایسی ملتی ہے کہ کثرتِ عبادت

پر کسی کو عتاب فرمایا گیا ہو۔ پھر کس طرح تصور کیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ایک عبادت گزار بندے کو عبادت کی زیادتی پر ان الفاظ میں تنبیہ فرماتا کہ "خواہش نفس کی پیروی نہ کر کہ یہ تجھے گمراہ کر دے گی"۔

ان وجوہ سے ہمارے نزدیک یہ تاویل بھی قابلِ قبول نہیں ہے۔

ان تمام احتمالات کے ساقط ہو جانے کے بعد وہی تاویل باقی رہ جاتی ہے جس کو ہم نے اختیار کیا ہے اور جس کی طرف بعض قدیم مفسرین بھی گئے ہیں، یعنی یہ کہ معاملہ اوریاہ کی بیوی ہی کا تھا، مگر اس کی اصلیت صرف اس قدر تھی کہ حضرت داؤد نے اپنے عہد کی اسرائیلی سوسائٹی کے عام رواج سے متاثر ہو کر اوریا سے طلاق کی درخواست کی تھی۔ یہ تاویل اس لحاظ سے بھی مرجح ہے کہ اگر اوریاہ کی بیوی کے معاملہ کی سرے سے کوئی اصلیت ہی نہ ہوتی تو قرآن مجید اس موقع پر صاف الفاظ میں اس کی تردید کرتا، جس طرح اس نے حضرت سلیمان کے حق میں کفر و شرک اور ساحری کے الزام کی تردید کی، کیونکہ یہودیوں میں یہ قصہ ایک امرِ واقعی کی طرح مشہور تھا اور قرآن کے لئے یہ غیر ممکن تھا کہ ایک نبی کا ذکر تو کرے مگر اس کے دامن پر ایسے شدید الزامات کا داغ بدستور رہنے دے۔ اس تاویل کو قبول کرنے میں لوگوں نے صرف اس بنا پر تامل کیا ہے کہ انبیاء کی طرف اس قسم کی لغزشوں کا انتساب، عصمتِ انبیاء کے خلاف معلوم ہوتا ہے لیکن ان حضرات نے شاید اس امر پر غور نہیں کیا کہ عصمت دراصل انبیاء کے لوازمِ ذات سے نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو منصبِ نبوت کی ذمہ داریاں صحیح طور پر ادا کرنے کے لئے مصلحۃً خطاؤں اور لغزشوں سے محفوظ فرمایا ہے، ورنہ اگر اللہ کی حفاظت تھوڑی دیر کے لئے بھی ان سے منفک ہو جائے تو جس طرح عام انسانوں سے بھول چوک اور غلطی ہوتی ہے، اسی طرح انبیاء سے بھی ہو سکتی ہے۔ اور یہ ایک لطیف نکتہ ہے کہ اللہ نے بالارادہ ہر نبی سے کسی نہ کسی وقت اپنی حفاظت اٹھا کر ایک دو لغزشیں سرزد ہو جانے دی ہیں تاکہ لوگ انبیاء کو خدا نہ سمجھ لیں، اور جان لیں کہ یہ بشر ہیں، خدا نہیں ہیں۔

اس قصہ میں دو چھوٹی چھوٹی غلط فہمیاں اور بھی ہیں جو زبان زد عام ہوگئی ہیں :-

ایک یہ کہ سیدنا داؤد علیہ السلام کی ۹۹ بیویاں تھیں۔ اس کی بنا یہ ہے کہ تمثیل میں ۹۹ دنبیوں کا ذکر ہوا ہے۔ لیکن درحقیقت ۹۹ سے محض کثرت مراد ہے نہ کہ بعینہ یہ عدد۔ مستغیث نے دراصل تمثیل کے پیرایہ میں اس بات کی طرف اشارہ کیا تھا کہ آپ کے پاس بہت سی عورتیں موجود ہیں، اور بہت سی عورتوں سے بیاہ کرنے کی آپ قدرت رکھتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ جو اشخاص خصم بن کر حضرت داؤد کے پاس پہنچے تھے وہ انسان نہیں بلکہ فرشتے تھے۔ اس گمان کی بنا اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ دیوار پھاند کر محراب میں پہنچ گئے تھے۔ لیکن یہ ایک بہت کمزور بات ہے۔ فرشتوں کا انسانی صورت میں آنا بجائے خود مستبعد نہیں، مگر یہاں نہ تو فرشتوں کے آنے کی کوئی خاص ضرورت نظر آتی ہے، اور نہ دیوار پھاندنا کوئی ایسی عجیب بات ہے کہ انسان کے لئے غیر ممکن ہو، اور صرف فرشتوں سے ہی بن آئے۔ پس جب اللہ نے تصریح نہیں کی کہ وہ فرشتے تھے، تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اپنے دل سے ان کو فرشتہ بنا دیں۔

بعض لوگوں نے خصمین کے ملائکہ ہونے کی ایک دلیل یہ بھی بیان کی ہے کہ حضرت داؤد ان کے آنے سے گھبرا گئے تھے لیکن یہ استدلال بھی کمزور ہے۔ جب کوئی شخص اپنی خلوت گاہ میں ہو جہاں کسی غیر کے آنے کا سان گمان بھی نہ ہو، اور اچانک کوئی شخص پھاند کر اس کے پاس پہنچ جائے تو فطرت کا تقاضا یہی ہے کہ وہ گھبرا جائے۔ اس میں ایسی کونسی انوکھی بات ہے کہ آنے والوں پر فرشتہ ہونے کا گمان کیا جائے۔

هٰذَا مَا عِنْدِيْ وَالْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ

رسائل و مسائل

نماز میں آلہ مکبّر الصّوت کا استعمال

جمادی الاخریٰ کے پرچے میں آلہ مکبر الصّوت پر جو فقہی بحث کی گئی تھی اس کو دیکھ کر ایک صاحب نے حضرت مولانا تھانوی مدظلہ العالی کا ایک فتویٰ مجھے بھیجا ہے جو اسی مسئلہ کے متعلق ہے۔ ذیل میں اس کو لفظ بلفظ نقل کیا جاتا ہے :۔

سوال

"کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک مشین ایسی ایجاد ہوئی ہے کہ مقرر کی آواز کو بہت فاصلہ تک اسی طرح پہنچا دیتی ہے جس طرح پاس کے اشخاص کو پہنچتی ہے۔ پس کیا یہ جائز ہے کہ ان مشینوں کے ذریعہ سے خطیب کی آواز کو تمام سامعین تک پہنچا دیا جائے ؟"

الجواب

"اوّل ایک قاعدہ سمجھ لیا جاوے جو کہ عقلی بھی ہے اور نقلی بھی۔ اور فقہائے حنفیہ نے اس قاعدہ پر بہت احکام کو متفرع کیا ہے۔ وہ یہ کہ جو مباح یا مندوب درجہ ضرورت و مقصودیت فی الشرع تک نہ پہنچا ہو، اور اس میں کوئی مفسدہ باحتمال قریب محتمل ہو تو اس مباح یا مندوب کا ترک اور اس سے منع کرنا لازم ہے۔ عقلی ہونا تو اس کا ظاہر ہے۔ اور قبول فقہاء کے بعد اس کے ماخذ نقلی کی نقل ضروری نہ تھی۔ مگر تبرعاً اس کو بھی نقل کرتا ہوں۔ سو اس کے نقلی ہونے کی تقریر

یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے وَلَا تَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ
فَیَسُبُّوا اللّٰہَ عَدْوًا بِغَیْرِ عِلْمٍ۔ سبّ آلہہ باطلہ مباح تو ضرور ہی ہے۔ اور بعض حالات میں
مندوب بھی۔ مگر مقصود مستقل نہیں کیونکہ اس کی غایت دوسرے طریق سے بھی حاصل ہو سکتی ہے۔
یعنی حکمت و موعظت و مجادلہ حسنہ سے۔ اور اس میں مفسدہ سبّ مشرکین ﷲ الحق کا ہے۔ اس لئے
اس سے نہی فرمادی گئی۔ اور اس قاعدہ کی تمہید کے بعد جواب ظاہر ہے کہ تبلیغ صوت سامعین بعید
تک شرعاً غیر ضروری ہے کیونکہ بعیدین کو دوسرے غیر مخدوش ذریعہ سے تبلیغ ممکن ہے اور
اس میں یہ مفسدہ محتمل کہ لوگ اس سے گنجائش سمجھ جاویں گے اس آلہ کو لہو میں استعمال کرنے
کی، یا دوسرے آلاتِ لہو کے استعمال کرنے کی۔ لہٰذا ترک اور منع لازم ہوگا۔ یہ تو اس وقت
ہے جب خطیب سے مراد مطلق واعظ اور لکچرار ہو۔ اور اگر اس سے مراد خطیب جمعہ وعیدین کا ہے
تو اس وقت تبلیغ صوت کا غیر ضروری ہونا اظہر ہے، اس لئے کہ خطبہ میں حضور مقصود ہے نہ کہ سماع صوت،
اور مفسدہ اقوی ہے کیونکہ اس آلہ کو مسجد میں داخل کرنا ہوگا جو کہ اس کے احترام کے خلاف ہے نیز تشبہ ہے مجالس
غیر مشروعہ کے ساتھ۔ اسی تشبہ کی بنا پر فقہاء نے غرس شجار فی المسجد کو منع فرمایا ہے اور تشبہ بالبیعہ والکنیسہ سے
معلل کیا ہے۔ واللہ اعلم۔"

یہ ایک ایسے جلیل القدر عالم کا فتویٰ ہے جو اس وقت دنیائے اسلام کے ممتاز ترین علماء کی صفِ اول میں ہیں۔ میرے علم کو ان کے علم سے وہ نسبت ہے جو ذرے کو آفتاب سے ہوتی ہے اگر اس نسبت کا لحاظ کروں تو مجھے نہ صرف یہ کہ اس پر کلام نہ کرنا چاہئے بلکہ اپنی تحقیق کو چھوڑ کر حضرت ممدوح کی تحقیق قبول کر لینی چاہئے لیکن جب میں سلف کے طریق پر نظر ڈالتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ وہاں من قال کو نہیں بلکہ ماقال کو دیکھنے کا قاعدہ جاری تھا۔ شاگرد، استاد کی تحقیق کے مقابلہ میں، اور چھوٹے بڑے کی رائے کے مقابلہ میں اپنی رائے اور تحقیق بے تکلف پیش کیا کرتے تھے، نہ اس غلط کے ساتھ کہ بڑوں کے علم سے ان کا علم زیادہ یا ان کے برابر ہے، بلکہ یہ سمجھ کر کہ حق کی تلاش و تحقیق ہر طالب العلم کا فرض ہے، اور اس تلاش و تحقیق میں اس کو شخصی عظمتوں کے تصور سے خالی الذہن

ہو کر نفسِ حقائق کو دیکھنا چاہیے۔ ان کے نزدیک یہ ضروری نہ تھا کہ ایک شخص دوسرے شخص کے برابر یا اس سے زیادہ علم رکھتا ہو تب ہی اس کے مقابلہ میں اپنی تحقیق پیش کرے، ورنہ چپ رہے اور اپنی فکر و نظر کو معطل کر کے اس کی تحقیق کو مان لے۔ اگر یہ ذہنیت اس زمانہ میں ہوتی تو امام ابو حنیفہ کے مقابلہ میں امام شافعی اور امام شافعی کے مقابلہ میں امام احمد کوئی مذہب اختیار نہ فرماتے۔ رحمہم اللہ۔ یہ حضرات رشد و ہدایت کے امام تھے اور ان کا طریقہ ہر زمانہ میں طالبانِ علم کے لئے بہترین نشانِ راہ ہے، اس لئے ان کی پیروی کرتے ہوئے میں بھی حضرت مولانا تھانوی کے مقابلہ میں اپنی علمی بے مائیگی کو جاننے کے باوجود اس فتویٰ پر کلام کر رہا ہوں۔

فتویٰ کی بنا جس قاعدہ پر رکھی گئی ہے وہ یقیناً مسلّم ہے۔ صرف فقہائے حنفیہ ہی نے نہیں بلکہ دوسرے ائمۂ اسلام نے بھی اس کو تسلیم کیا ہے، اور ایک آیت نہیں بلکہ کتاب و سنت کی متعدد تصریحات اس کا ماخذ ہیں۔ لیکن یہ امر محلِ نظر ہے کہ آیا اس خاص جزئیہ میں بھی یہ قاعدہ جاری ہو سکتا ہے یا نہیں۔ آلۂ مکبر الصوت کو کسی حیثیت سے بھی آلۂ لہو نہیں کہا جا سکتا۔ آلۂ لہو کا اطلاق اصلاً تو اس آلہ پر ہوتا ہے جو لہو ہی کے لئے بنایا گیا ہو، اور اس کا کوئی دوسرا استعمال بجز لہو کے نہ ہو، مثلاً بانسری یا ہارمونیم۔ اور تبعاً اس کا اطلاق ایسے آلہ پر بھی ہو سکتا ہے جو اگرچہ بجائے خود لہو کے لئے موضوع نہ ہو لیکن اس کا غالب استعمال لہو ہی میں ہو، مثلاً گراموفون۔ مکبر الصوت ان دونوں صنفوں میں سے کسی صنف میں بھی داخل نہیں۔ اس کو صرف اس لئے بنایا گیا ہے کہ چھوٹی آواز کو بڑا کر دے اور دور تک پہنچائے۔ اس کا استعمال لہو اور غیر لہو دونوں میں ہوتا ہے، اور غیر لہو میں بہ نسبت لہو کے زیادہ ہوتا ہے۔ اس کی مثال تو ایسی ہے جیسے شیشے کا گلاس کہ اس میں شراب بھی پی جاتی ہے اور حلال مشروبات بھی، یا بجلی کا لیمپ اور برقی پنکھا کہ یہ چیزیں تھیٹروں اور رقص خانوں اور فحش کدوں میں بھی استعمال ہوتی ہیں اور پاک مجلسوں میں اور مباح اغراض میں بھی۔ اب اگر ناجائز استعمال کی وجہ سے ان چیزوں کو آلۂ لہو یا آلۂ منکر نہیں کہا جا سکتا، تو مکبر الصوت کو بھی نہیں کہا جا سکتا۔ اگر گلاس اور پنکھے اور لیمپ کے استعمال میں مجالسِ غیر مشروعہ سے تشبہ نہیں ہے تو مکبر الصوت میں بھی نہیں ہے۔ اگر شیشے کا گلاس استعمال کرنے سے اس مفسدہ کا احتمال نہیں ہے کہ لوگ اس کو شراب نوشی میں استعمال کرنے کی گنجائش نکال لیں گے اور اگر مسجدوں میں بجلی کی روشنی اور پنکھا لگانے سے یہ مفسدہ پیدا نہیں ہوتا کہ لوگوں کے لئے رقص خانوں میں جانے کی گنجائش نکل آئے گی، تو مکبر الصوت کے استعمال میں بھی ایسے کسی مفسدہ کا احتمال نہیں۔ جب برقی پنکھے اور روشنی کے قمقمے لگانا احترامِ مسجد کے خلاف

نہیں ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ مکبر الصوت لگانا اہانتِ مسجد کا موجب ہو۔

اس میں شک نہیں کہ مکبر الصوت اس زمانہ میں زیادہ تر بلکہ تمام تر معروف کے بجائے منکر کی خدمت کر رہا ہے لیکن آج کونسی چیز ہے جو منکر کی خدمت نہیں کر رہی ہے۔ قلم ودوات سے لے کر چھاپہ کی مشین، ریل، موٹر، ہوائی جہاز اور ریڈیو تک ہر چیز کا غالب استعمال آج فحشا و منکر ہی کے لئے ہو رہا ہے، ہر چیز ظلم و عصیان کی خدمت لی جا رہی ہے، اور ان سے اس تہذیب کو فروغ دیا جا رہا ہے جس کی بنیاد نا خدا شناسی بلکہ خدا سے بغاوت پر رکھی گئی ہے۔ اس کی وجہ بجز اس کے کچھ نہیں کہ خدا کی پیدا کی ہوئی طاقتوں کو دریافت کرنے اور ان سے خدمت لینے کا سارا کام آج وہ لوگ کر رہے ہیں جو خدا پر ایمان نہیں رکھتے۔ اور جو خدا پر ایمان رکھتے ہیں انھوں نے اسبابِ عالم کو قابو میں لانے اور ان سے معروف کی خدمت لینے کا کام چھوڑ رکھا ہے۔ اسی وجہ سے پورا انسانی تمدن ناپاک ہو گیا ہے اور دنیا کی ہر چیز آلۂ منکر بن کر رہ گئی ہے۔ اب اگر ہم ایک ایک چیز کو اس بنا پر چھوڑتے چلے جائیں کہ فلاں چیز آلۂ منکر ہے اور فلاں چیز کو استعمال کرنے سے فاسقین و ظالمین کے ساتھ تشبہ ہو جائے گا، تو ہمیں تمدن ہی سے الگ ہو جانا پڑے گا، اور یہ مزید غلطی ہوگی۔ اس سے خدا پرست تہذیب اور زیادہ مغلوب اور ظالمانہ تہذیب اور زیادہ غالب ہوتی چلی جائے گی، اس لئے کہ جو تہذیب مشینوں کے زور سے پھیل رہی ہو اس کے مقابلہ میں وہ تہذیب کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی جو تمام کارگر ذرائع اور طاقت ور اسباب سے خود ہی دست بردار ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ موٹر پر دوڑنے والے کا مقابلہ چھکڑے پر چلنے والا نہیں کر سکتا۔ جو لوگ ریڈیو کے زور سے ایک سکنڈ کے اندر باطل کی آواز کرۂ زمین کے ایک ایک کونے میں پہنچا دیں، اور کروڑہا کروڑ انسانوں کے خیالات کو ایک جنبشِ زبان سے مسموم کر کے رکھ دیں ان کے مقابلہ میں وہ لوگ کیسے کامیاب ہو سکتے ہیں جو ایک جلسہ کے سامعین تک بھی حق کی آواز پہنچانے میں خدا کی پیدا کی ہوئی ایک طاقت سے کام لیتے ہوئے جھجکتے ہوں۔ منکر کی آواز بلند کرنے والے تو ایک شخص کو بھی اپنی بات سنائے بغیر چھوڑنا پسند نہ کریں، اور معروف کی آواز بلند کرنے والوں کا اندازِ فکر یہ ہو کہ سامعینِ بعید تک تبلیغِ صوت شرعاً ضروری تو ہے نہیں، لہٰذا کیوں اس کی کوشش کی جائے۔ اس طرزِ عمل کا انجام جو کچھ ہوگا، بلکہ ہو رہا ہے اس کو ہر شخص بادنیٰ تامل جان سکتا ہے۔ اس کے معنی دراصل یہ ہیں کہ ہم ایک ایک ہتھیار کو یہ کہہ کر پھینکتے جائیں کہ دشمن کے استعمال سے وہ گندہ ہو گیا ہے، اور دشمن ان سب ہتھیاروں کو اٹھا کر ہم پر حملہ

کرتا چلا جائے۔

یہ ارشاد بالکل بجا ہے کہ سامعین بعید تک تبلیغ صوت شرعاً غیر ضروری ہے، مگر یہ درست نہیں ہے کہ تبلیغ صوت اور سماع حاضرین کو درجہ مقصود فی الشرع حاصل نہیں۔ نماز میں قرآن اسی لئے پڑھا جاتا ہے کہ مقتدی اس کو سنیں۔ خود قرآن میں اس مقصد کی تصریح موجود ہے کہ وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا۔ خطبہ بھی اسی لئے دیا جاتا ہے اور شارع نے اسی غرض سے خطبہ کے وقت بات چیت سے منع کیا ہے۔ استماع کا مقصود ہونا تو نقلاً بھی ثابت ہے، اور عقلاً بھی۔ ظاہر ہے کہ کلام اسی لئے ہوتا ہے کہ لوگ اس کو سنیں۔ منہ سے آواز اسی لئے نکالی جاتی ہے کہ کانوں تک پہنچے۔ اب رہا یہ امر کہ شارع نے اس کو ضروری کیوں نہیں قرار دیا، تو میں عرض کروں گا کہ یہ رخصت کے قبیل سے ہے۔ چونکہ اس زمانہ میں کوئی ایسا ذریعہ موجود نہ تھا جس سے دور تک آواز پہنچائی جاسکے، اور آج بھی ہر وقت ہر جگہ مکبر الصوت مہیا نہیں ہوسکتا اس لئے استماع کو لازم نہیں کیا گیا کہ اس کے بغیر نماز ہی نہ ہو، یا حضور خطبہ کا ثواب ہی حاصل نہ ہوسکے۔ مگر اس نرمی اور رخصت کو جو محض طبعی موانع کا لحاظ کرکے عطا کی گئی ہے، اس امر کی دلیل نہیں بنایا جاسکتا کہ تبلیغ صوت کا اہتمام غیر ضروری ہے حتیٰ کہ اگر اس کے لئے کوئی ذریعہ مہیا ہو جائے تب بھی اسے قصداً ترک کر دیا جائے۔

آخر میں یہ بات بھی صاف کر دینا چاہتا ہوں کہ اس مسئلے پر میرے بار بار لکھنے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ مجھے خاص طور پر لاؤڈ اسپیکر سے کوئی دلچسپی ہے۔ بلکہ دراصل میرا مقصد یہ ہے کہ سائنٹفک ایجادات اور تمدن حدیث کے آلات و وسائل کے متعلق مسلمان اپنا رویہ بدلیں۔ یہ آلات بجائے خود ناپاک نہیں ہیں۔ اصل میں وہ طریق استعمال ناپاک ہے جو مغرب کی باغیانہ تہذیب نے اختیار کر رکھا ہے۔ خداوند عالم نے جن چیزوں کو انسان کے لئے مسخر کیا ہے وہ بالیقین پاک اور مطہر ہیں اور ان کی فطرت یہ چاہتی ہے کہ ان سے خدائی قانون کے مطابق کام لیا جائے، مگر ان پر دوہرا ظلم ہو رہا ہے کہ جن کے پاس خدائی قانون موجود ہے وہ ان سے کام نہیں لیتے، اور جو ان سے کام لے رہے ہیں وہ شیطانی قانون کے متبع ہیں۔

مدیر ترجمان القرآن کی تالیفات

الجہاد فی الاسلام مختصر فہرست مضامین حسبِ ذیل ہے :-

۱- اِسلامی جہاد کی حقیقت اسمیں بتایا گیا ہے کہ قرآن کی تعلیمِ جہاد کن اہم حقائق پر مبنی ہے اور نظامِ تمدن میں روحِ جہاد کا کیا مرتبہ ہے

۲- مدافعانہ جنگ وہ اغراض جن کے لئے قرآن نے دفاعی جنگ کا حکم دیا ہے۔

۳- مصلحانہ جنگ اصلاحی جنگ کے اصول و مقاصد کی تشریح اور ان اعتراضات کا جواب جو اس نوع کی جنگ پر کیے جاتے ہیں

۴- اشاعت اسلام اور تلوار- دعوت و تبلیغ کے متعلق اصول تعلیم اسلامی کی تشریح اور اس امر کی تحقیق کہ اشاعتِ اسلام میں تلوار کا کیا حصہ ہے۔

۵- قوانینِ جنگ اسلام سے قبل کے وحشیانہ طریقہائے جنگ اور اُن میں اسلام کی اصلاحات۔

۶- جنگ دوسرے مذاہب میں- جنگ کے متعلق ہندو مذہب، بودھ مت، یہودیت اور مسیحیت کی تعلیمات پر مفصل تبصرہ۔

۷- جنگ اور تہذیب جدید- بین الاقوامی قانونِ جنگ کی تفصیل اور اسلامی قانون سے اسکا مقابلہ- قیمت مجلد ۵؎ غیر مجلد للعہ؎

رسالہ دینیات یہ رسالہ ہائی اسکول کی آخری جماعتوں میں تعلیم پانے والے لڑکوں اور لڑکیوں کیلیئے لکھا گیا ہے- اِس میں تعلیم دینیات کا بالکل جدید طرز اختیار کیا گیا ہے- مُسلمان نوجوانوں کو کالج کی منزل میں داخل ہونے سے پہلے یہ رسالہ پڑھا دینا بہت ضروری ہے- اِسمیں بہترین عقلی دلائل کے ساتھ اسلام کی بنیادی تعلیمات اور اصُولِ شریعت کو سمجھایا گیا ہے اور ان شبہات کو رفع کیا گیا ہے جو زمانۂ جدید کے دماغوں میں عموماً پیدا ہوتے ہیں۔

طلبہ کے علاوہ عام ناظرین اور خصوصاً جدید تعلیم یافتہ حضرات کے لیے بھی اِس رسالہ کا مُطالعہ فائدہ سے خالی نہیں نیز علماء بھی اس سے مستفید ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ رسالہ انکو بتائیگا کہ اِس دور میں اسلام کو پیش کرنیکا صحیح طریقہ کیا ہے۔

قیمت ۱۰؍ محصولڈاک ۲؍ خرچ وی پی ۳؍

دفتر ترجمان القرآن لاہور سے طلب کیجیے

سوسل و تصاویر پرنٹ پریس ... روڈ لاہور میں طبع ہوتا

مسلمان

اور

موجودہ سیاسی کشمکش

اس کتاب میں ایڈیٹر ترجمان القرآن کے وہ سیاسی مضامین یکجا جمع کر کے شائع کیے گئے ہیں جو ترجمان القرآن کی اشاعتہائے سابقہ میں محرم ۱۳۵۶ھ سے رجب ۱۳۵۶ھ تک لکھے گئے تھے۔ یہ کتاب اصل میں اسلامی ہند کی گذشتہ تاریخ، موجودہ حالت، اور مستقبل کے امکانات پر ایک مدبرانہ تبصرہ ہے، جس سے مسلمانانِ ہند کے دل و دماغ میں ان کے قومی مسئلہ کا ایک نیا تصور پیدا ہوتا ہے۔ کوئی لکھا پڑھا مسلمان اس کے مطالعہ سے محروم نہ رہنا چاہئے۔ یہ کتاب اصل لاگت پر فروخت کی جا رہی ہے۔ ذیل کے نرخوں پر آپ اسے طلب فرما سکتے ہیں۔

ایک روپے میں	۵ نسخے	علاوہ محصول ڈاک
نو روپے میں	۵۰ نسخے	کرایہ ریل بذمہ خریدار
پندرہ روپے میں	۱۰۰ نسخے	

نوٹ: محصول ڈاک فی نسخہ سات پیسے بذمہ خریدار۔ ریلوے پارسل کے ذریعہ کم از کم ۲۵ نسخے منگوانے میں فائدہ رہتا ہے۔

شعبۂ اشاعت دار الاسلام (پٹھان کوٹ - پنجاب)

سرور دق پرنٹنگ پریس نیل روڈ لاہور میں طبع ہوا